

بہشتی



دو ہیبت مناک اور پیر تحسین ناولٹ

پیر  
سلامت علی مہدی

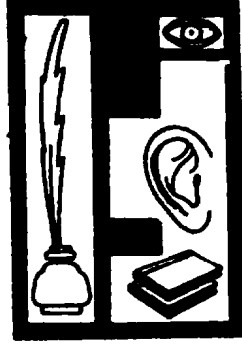
پیر اسرار حمزہ

\*

نواہ ناشرین کتب

راچی پوت مارکیٹ اردو بازار لاہور

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں



PH 7223600

باراؤل	.....	۲۰۰۰ء
ناشر	.....	رانا محمود علی
سرورق	.....	ذاکر
انتخاب	.....	واجہ امام بخش
کمپوزنگ	.....	اعظم انوار، نثار



بناکسٹ

— رشید نیوز ایجنسی —

اخبار مارکیٹ — فریئر روڈ — کراچی

PH-7760892

## پیش لفظ

ادارے کی پہلی کاوش ”بلی“ کے نام سے حاضر ہے۔

اس میں دو مشہور و معروف مصنفین کے ناولٹ شامل ہیں جن میں ناولٹ ”بلی“ مصنف سلامت علی مہدی کی سب سے دلچسپ کہانی ہے۔ یہ ایک رسالے میں قسط وار چھپتی رہی ہے اور پڑھنے والوں نے اسے بیحد پسند کیا۔

دوسرا ناولٹ جی، ایچ، ویلز کا ترجمہ ہے جس کے مترجم جناب مظہر الحق علوی ہیں۔ موصوف نے اب تک بے شمار انگریزی ناولوں کے سلیبس اور بامحاورہ ترجمے پیش کئے ہیں جو بہت مقبول ہوئے۔ موضوع کے اعتبار سے ان کا مذکورہ ناول ”پراسرار جزیرہ“ بھی ایک حیرت انگیز اور سسپنس سے بھرپور ناول ہے جسے پڑھ کر آپ یقیناً محظوظ ہوں گے۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس پیچیدہ ناول کو اردو میں ڈھال کر مترجم نے بڑی خوبصورتی سے ترجمے کا حق ادا کر دیا ہے۔

اب آپ اس ناولٹ کو پڑھئے اور اس کے بعد ہمیں اپنی قیمتی رائے سے بھی آگاہ کیجئے کہ ہماری یہ پیش کش کس حد تک کامیاب رہی ہے۔

ہم آپ کے مشوروں کے منتظر رہیں گے۔

## ایک نظر

کیا آپ نے کوئی ایسی بلی دیکھی ہے جو دیکھنے میں تو ایک بلی نظر آتی ہے لیکن پلک جھپکنے میں وہ ایک حسین و جمیل دوشیزہ کا روپ دھار لیتی ہے۔

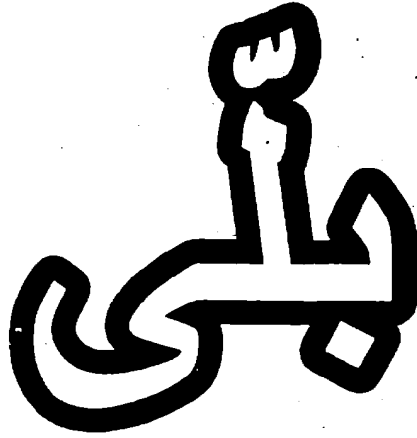
یہ کہانی ایک ایسی ہی بلی کی ہے۔ ایک خوبصورت نازنین جو پُر اسرار علوم سے واقفیت رکھنے کی وجہ سے تین سو سال سے اپنے حسن و جمال کو برقرار رکھے ہوئے ہے اور اپنے بچھڑے ہوئے محبوب کی تلاش میں سرگرداں ہے۔

ایک وجہیہ و شکیل نوجوان ظفر پہلی ہی ملاقات میں اس کی اصلیت سے آگاہ ہو کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ اب بلی مشکل میں پڑ جاتی ہے کہ کسی طرح ظفر کا خاتمہ کر ڈالے لیکن وہ اپنی چالاکی سے ہمیشہ وہ اس کے داؤ پیچ سے بچ نکلتا ہے۔

امید ہے کہ آپ بھی اس خونخوار بلی کے کارنامے پڑھیں گے تو حیران رہ جائیں گے۔ یہ میرا دعویٰ ہے۔

سلامت علی مہدی

# ایک سنسنی خیز اور ہیبتناک ناولٹ



مصنف

سلامت علی مہدی



عدالت کے کمرے میں تل رکھنے کی گنجائش نہ تھی۔  
 آج ملزم ظفر اپنی صفائی میں بیان دینے والا تھا۔ پولیس کی طرف سے ان پر قتل کا الزام ثابت کیا جا چکا تھا۔ سرکاری وکیل اپنی دلیلوں سے ممبران جیوری اور عدالت کو یہ باور کرا چکا تھا کہ ملزم ظفر ہی ناہید کا قاتل ہے۔ اس ناہید کا قاتل جو اس کے عزیز دوست حمید کی حسین و جمیل بیوی تھی۔

لیکن ظفر نے ارتکاب جرم سے انکار کیا تھا۔ اور آج وہ اپنی صفائی میں بیان دینے والا تھا۔ مقدمہ اتنا پیچیدہ اور اتنا پر اسرار رنگ اختیار کر چکا تھا کہ اس کا انکاری بیان سننے کے لیے سارا شہر عدالت کے سامنے امنڈ آیا تھا۔ لوگوں کی سہولت کے لیے معزز جج نے کمرہ عدالت کے باہر لاؤڈ سپیکر لگوا دیئے تھے تاکہ ہر شخص کے کانوں میں ظفر کی آواز پہنچ جائے۔

ٹھیک ساڑھے دس بجے ظفر کو عدالت کے سامنے پیش کیا گیا۔ ہر شخص کی نظریں اس کے پریشان چہرے کی طرف اٹھ گئیں۔ بڑھی ہوئی داڑھی، بے ترتیب بال، ملگجے کپڑے، سوکھے ہونٹ، متلاشی آنکھیں، کھلاتے ہوئے رخسار۔۔۔ یہ تھا وہ ظفر جو آج سے پندرہ دن پہلے اپنی سوسائٹی کا سب سے خوب و اور سب سے ہنس مکھ نوجوان سمجھا جاتا تھا۔



پانچ منٹ کے اندر مقدمہ کی کارروائی شروع کر دی گئی۔ ملزم ظفر نے اپنی مدہم لیکن یقین اور اعتماد سے بھرپور آواز میں کہنا شروع کیا۔ ”میں سچ کہتا ہوں میں نے ناہید کو قتل نہیں کیا۔ حالانکہ مجھے پورا یقین ہے کہ عدالت اور قانون مجھے ناہید کا قاتل ہی سمجھ رہے ہیں۔ اس کے باوجود میں پھانسی کے تختے تک یہی کہتا رہوں گا کہ میں نے ناہید کا قتل نہیں کیا۔ میں ناہید کا قاتل نہیں ہوں۔ البتہ ایک بلی کا قاتل ضرور ہوں۔ ایک سیاہ اور بھیانک آنکھوں والی خونخوار بلی کا قاتل۔ میں نے گولی بلی پر چلائی تھی۔ بلی میرے کمرے میں موجود تھی۔ گولی کھا کر وہ بھاگی میں نے اس پر دوبارہ گولی چلانے کے لیے تعاقب کیا اور دوسری گولی اس کے سر سے ڈھیر کر دیا۔

میں حیران ہوں کہ پولیس یہ کیسے کہتی ہے کہ میں نے بلی کو نہیں ناہید کو گولی ماری تھی اور میرے پستول کی گولی بلی کے نہیں ناہید کی چھاتی سے برآمد ہوئی ہے۔ ناہید تو اس وقت مکان میں ہی نہیں تھی جب بلی نے مجھ پر حملہ کیا اور میں نے گھبرا کر اس پر فائر کر دیا۔ اب آپ ہی بتائیے جب ناہید مکان میں تھی ہی نہیں تو میں نے اس پر گولی چلائی کیسے؟ میں نے بلی کو مارا تھا۔ بلی زخمی ہو کر میرے سامنے بھاگی تھی اور پھر میرے ہی سامنے اس نے دم توڑا تھا۔ لیکن پولیس کہتی ہے کہ مکان کی راہداری میں کسی بلی کی لاش نہیں پائی گئی بلکہ ناہید کی لاش ملی اور اس کی لاش اس کے اپنے کمرے میں بستر پر پائی گئی۔

تھوڑی دیر کے لیے رک کر ظفر نے لوگوں کو متحس نظروں سے دیکھا اور پھر دوبارہ بیان شروع کیا۔

”میں جانتا ہوں کہ میری اس کہانی پر شاید ہی کوئی یقین کرے لیکن میرے لیے اس کہانی کا سنا ضروری ہے۔ کیونکہ میں بے گناہ پھانسی کے تختے پر چڑھنا نہیں چاہتا۔ البتہ اگر کسی خونخوار اور بھیانک بلی کا قتل ایک ایسا جرم ہے جس کی سزا پھانسی ہے تو میں یہ سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے بلی کا قتل کیا کیونکہ اگر میں اس بلی کو قتل نہ کرتا تو یہ بلی خود مجھے ہلاک کر دیتی۔“

”میں عدالت اور ممبران جیوری سے درخواست کروں گا کہ وہ میرے بیان کے ایک ایک لفظ پر یقین کریں اور اس کے کسی بھی لفظ کو جھوٹ اور غلط نہ سمجھیں، ورنہ قانون کے ہاتھوں میری بے گناہی کی موت کی ساری ذمہ داری ان پر عائد ہوگی کیونکہ آج تک ایسا نہیں ہوا ہے کہ کسی بلی کے قاتل کو پھانسی کی سزا دی گئی ہو۔“

لوگ بڑے انہماک اور توجہ سے ظفر کا بیان سن رہے تھے۔

”حمید اور میں بچپن کے دوست تھے۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ ایک ہی اسکول اور ایک ہی کالج میں تعلیم پائی تھی۔ ہم دونوں کا بچپن بھی ایک ہی ساتھ بیتا تھا اور دونوں کی جوانی بھی ایک ساتھ ہی آئی تھی۔ تعلیم کے بعد میں اپنے باپ کے کاروبار میں ہاتھ بٹانے کے لیے ممبئی چلا گیا اور میرے دوست حمید کو جھڈل پور میں ملازمت مل گئی۔ لیکن اس دوری کے باوجود ہم دونوں کی دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ہر ہفتے ہم دونوں ایک دوسرے کو خط لکھا کرتے اور اپنی سرگرمیوں سے ایک دوسرے کو مطلع کرتے رہتے۔

”دو سال پہلے اس نے مجھے لکھا تھا کہ اس کی شادی ہونے والی ہے اور شادی کی تاریخ بھی مقرر ہو چکی ہے۔ میں حیران ہوا کہ اتنی جلد حمید نے اپنی شادی کیسے طے کر لی جب کہ پچھلے ہفتے کے خط میں اس نے اپنی کسی محبت تک کا ذکر نہیں کیا تھا۔

حمید نے لکھا تھا کہ اس کی ہونے والی بیوی بے پناہ خوب صورت ہے۔ اس کی عمر صرف بیس سال ہے اس کے والدین غریب ہیں، دونوں کی ملاقات ایک محفل میں ہوئی اور دو دن کے اندر دونوں ایک دوسرے کی گہری محبت میں گرفتار ہو گئے۔ پھر حمید نے شادی کا پیغام بھیج دیا۔ اور اب ایک ہفتے کے بعد ان دونوں کی شادی ہونے والی تھی۔

میں نے بے حد کوشش کی کہ اپنے دوست کی شادی میں شریک ہو جاؤں لیکن اپنی انتہائی کاروباری مصروفیت کی بنا پر میں اس شادی میں نہ جاسکا اور وقت مقررہ پر شادی خیر و خوں ہو گئی۔

میں نے اس کو خط لکھ کر شادی کی مبارکباد دی۔ اور ایک قیمتی تحفہ بھی بھیجا۔ میں واقعی اپنے دوست کی شادی پر خوش تھا۔ صرف اس لیے نہیں کہ وہ میرا دوست تھا بلکہ اس لیے بھی کہ میرا دوست اتنا بد صورت تھا کہ دنیا کی کوئی بھی عورت اس کو دیکھ لینے کے بعد اس سے شادی کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتی تھی۔

آپ سب حضرات مقدمے کے دوران میں حمید کو خود دیکھ چکے ہیں اور آپ کو خود بھی اندازہ ہو گا کہ وہ کتنی خوفناک حد تک بد صورت ہے۔

شادی کے چند ہی دنوں بعد حمید نے مجھے دوسرا خط لکھا۔ یہ خط اس کی اور ناہید کی محبت بھری نئی زندگی کی کہانی سے بھرا ہوا تھا۔ خط کے ایک ایک لفظ سے حمید کی دلی مسرت پھوٹ نکلتی تھی۔ مجھے ایک لمحہ بھر کے لیے یہ حیرت ضرور ہوئی کہ ایک خوبصورت عورت ایک بد صورت مرد سے اتنی دیوانہ وار محبت کیسے کر سکتی ہے لیکن یہ

ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب منطق سے نکالنا درست نہ ہوتا، کیونکہ بیوی کی یہ دیوانہ وار محبت بہر حال حقیقت تھی۔“

اسی طرح ہم دونوں دوستوں کی خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ ایک سال کے بعد حمید نے لکھا کہ ناہید کے والد کا اچانک انتقال ہو گیا اور اب وہ بے حد مغموم رہتی ہے۔ میں نے جواب میں تعزیت کا خط بھیج دیا۔

حمید جھل پور میں پی ڈبلیو ڈی کا سول انجینئر تھا۔ اس زمانے میں پہاڑوں کو کاٹ کر نئی سڑکیں بنائی جا رہی تھیں اور حمید کو زیادہ تر گھر سے باہر رہنا پڑتا تھا۔ اس کی مصروفیات اتنی زیادہ بڑھ گئی تھیں کہ وہ ہفتے میں زیادہ سے زیادہ ایک دن ناہید کے ساتھ بسر کرتا اور پھر اجاڑ پہاڑوں کی طرف واپس لوٹ جاتا۔

وہ زیادہ سے زیادہ وقت مغموم اور دل شکستہ ناہید کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا لیکن ملازمت کی ذمہ داریاں اس کی اس تمنا کی راہ میں حائل تھیں۔ مجبور ہو کر اس نے دو ماہ کی رخصت لی اور نینی تال جانے کا پروگرام بنایا۔ اس نے مجھے بھی لکھا کہ چند دن کے لیے نینی تال چلا آؤں۔

حمید کو نہ دیکھے ہوئے مجھے دو سال سے اوپر ہو چکے تھے۔ اور پھر میں ناہید کو بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے بھی نینی تال جانے کا پروگرام بنالیا اور وقت مقررہ پر نینی تال روانہ ہو گیا۔ نینی تال جانے کے لیے مجھے بریلی جنٹیشن پر گاڑی بدلنا تھی۔ اس وقت رات کے دس بج چکے تھے۔ میری سیٹ پہلے سے ریزرو تھی۔ کنڈیکٹر نے مجھے میرے کمپارٹمنٹ تک پہنچا دیا لیکن جب میں اندر داخل ہوا تو یہ دیکھ کر مجھے دلی مسرت ہوئی کہ کمپارٹمنٹ میں دو مرد مسافروں کے علاوہ ایک عورت مسافر بھی موجود ہے۔

یہ عورت بھی نینی تال ہی جا رہی تھی۔

عورت اتنی حسین اور پرکشش تھی کہ بار بار میری نگاہیں بے اختیار اس کی طرف اٹھ جاتیں۔ اس کی آنکھوں کی سیاہ پتلیوں میں بلا کی گہرائی تھی۔ رنگ بالکل سفید تھا، جسم انتہائی سبک اور نازک۔ اور ہونٹ اتنے سرخ تھے کہ ان پر تریوز کی سرخ پھانک کا گمان ہوتا تھا۔

ایک گھنٹے کے بعد ہم چاروں مسافر لیٹ گئے۔ لائٹ بجھا دی گئی۔ عورت کا بستر میرے سامنے والی پچی سیٹ پر تھا اور وہ چادر اوڑھے گہری نیند سو رہی تھی۔ تقریباً گیارہ بجے رات تک میں ہلکی اور مدہم روشنی میں اس کے خوب صورت چہرے کو تکتا رہا پھر مجھے بھی نیند آ گئی۔

رات کے دو بجے اچانک میری آنکھ کھلی۔ لازماً سب سے پہلے عورت کے بستر ہی کی طرف گئی۔ اور پھر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مارے خوف کے میرے منہ سے ایک چیخ سی نکل جائے گی۔ ایک دہشتناک منظر میرے سامنے تھا۔

میں نے دیکھا کہ بستر پر عورت کی بجائے ایک بلی لیٹی ہوئی ہے۔ بالکل سیاہ بلی۔ اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے یہ بلی بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ عورت کی سیٹ پر عورت کی بجائے ایک سیاہ اور خوفناک بلی کو دیکھ کر میری کیا حالت ہو گئی ہوگی۔ میں یہ سوچتا رہا کہ سیٹ پر لیٹی ہوئی عورت کہاں چلی گئی؟

میرے ذہن میں ایک سوال یہ بھی ابھر رہا تھا کہ جس وقت میں کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا تھا اس وقت وہاں کوئی بلی نہیں تھی، پھر چلتی ٹرین میں یہ بلی کہاں سے آگئی؟۔ کمپارٹمنٹ کے دروازے تو اندر سے بند تھے۔

کمپارٹمنٹ میں اس وقت بالکل اندھیرا تھا لیکن نیلے بلب کی ہلکی روشنی میں مجھے عورت کا بستر بھی نظر آ رہا تھا اور بلی کی چمکتی آنکھیں بھی۔ میں دم سادھے بلی کو دیکھتا رہا، دم سادھے اپنے جسم کو حرکت دیئے بغیر میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنی ہم سفر ساتھی عورت کو تلاش کرتا رہا، لیکن آپ میری بات پر یقین کریں کہ وہ عورت اپنے بستر پر نہیں تھی۔ باتھ روم میں اگر روشنی ہوتی تو میں یہ سمجھ کر اپنے دل کو تسکین دے لیتا کہ شاید وہ عورت باتھ روم میں ہو، لیکن باتھ روم میں بھی اندھیرا تھا۔

اب بلی میری نگاہوں کے سامنے انگڑائیاں لے رہی تھی۔ اور بار بار اپنے پنجوں سے اپنا منہ کھرچ رہی تھی۔ منظر اتنا خوفناک، ناقابل تصور اور اتنا حیرت زار تھا کہ میں نے اپنی رگوں کا خون جمنا ہوا محسوس کیا۔ اور پھر ایسا محسوس کیا کہ جیسے میری چیخ میرے حلق میں پھنس کر رہ گئی ہے۔ کیونکہ میں چیخنا چاہتا تھا لیکن میری آواز میرے ارادے کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

پھر بلی اچھل کر اپنی سیٹ سے نیچے اتر آئی۔ آہستہ آہستہ دبے قدموں پھر اس نے سب سے پہلے مجھے دیکھا اور مجھے سوچنے لگی رہی۔ اس وقت مجھ پر اتنی دہشت طاری تھی کہ میری آنکھیں خود بخود بند ہو گئی تھیں۔ میرے بعد اس نے باقی مسافروں کے جسموں کو بھی سونگھا اور پھر دوبارہ اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئی۔

اب میرے لیے اس کا وجود ناقابل برداشت ہو چکا تھا۔ یکلخت میرے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکلی۔ اور اس چیخ کے ساتھ ہی میں نے اچھل کر کمپارٹمنٹ کی ہتی جلادی۔

لیکن۔۔۔ آپ یہ سن کر ضرور حیران ہوں گے کہ جب کمپارٹمنٹ میں چلی کی روشنی پھیلی تو بستر پر ملی کا کوئی پتہ نہیں تھا۔۔۔ بلکہ اس پر وہی ہمسفر عورت سو رہی تھی۔

میری اچانک چیخ پر تمام مسافر جاگ گئے۔ عورت بھی ایک مختصر سی انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھی۔ اس کی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ وہ متوحش نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

سب حیران تھے کہ سوتے سوتے میں چیخ کیوں پڑا۔ لیکن جب میں نے انہیں بتایا کہ ابھی چند لمحے پہلے ایک ملی اس کمپارٹمنٹ میں ہر مسافر کا منہ سو نگھ رہی تھی تو کسی نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔۔۔ سب کا متفقہ فیصلہ تھا کہ میں کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا تھا۔

”ہو سکتا ہے آپ اسے میرا وہم سمجھیں، یا یہ سمجھیں کہ میں نے خواب میں ملی کو دیکھا ہو گا۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے جاگنے کے عالم میں عورت کی بجائے ایک سیاہ ملی کو ہی اس کے بستر پر دیکھا تھا۔ میں مسلسل پانچ منٹ تک اس ملی کو دیکھتا رہا تھا۔ میں وہمی ہر گز نہیں ہوں اس لیے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میری نگاہوں نے دھوکا کھایا ہو گا یا میں وہم کا شکار ہو گیا ہوں گا۔ بعد میں میں نے پورے کمپارٹمنٹ کی تلاشی لے ڈالی لیکن وہاں ملی کا نام و نشان تک نہیں تھا اس کے بعد تمام رات مجھے نیند نہیں آئی۔ تمام رات میں گھور گھور کر سوئی ہوئی عورت کی طرف دیکھتا رہا اور تمام رات ملی کے وجود کے بارے میں سوچتا رہا۔۔۔ ملی یا عورت۔۔۔ عورت یا ملی۔۔۔ آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ تمام رات میرے دلی و دماغ کی کیا حالت رہی ہو گی۔۔۔؟

صبح پانچ بجے کا ٹھہ گودام کا اسٹیشن آگیا۔ اور تمام مسافر کمپارٹمنٹ سے اتر گئے۔ نینی تال جانے کے لیے میں نے بس کی بجائے ٹیکسی کر لی۔ صبح آٹھ بجے ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر میں ٹیکسی پر ہی نینی تال کے لیے روانہ ہو گیا۔ راستہ بے حد دلکش تھا لیکن مجھ پر تو ہمسفر ملی کا تصور چھایا ہوا تھا۔ میں راستے کے قدرتی مناظر سے کوئی لطف نہیں اٹھا سکا۔



”ایک گھنٹے کے بعد میں نینی تال پہنچ گیا۔“

میں اپنے دوست حمید کو اپنی روانگی کا تار دے چکا تھا۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت اور مایوسی ہوئی کہ وہ ریلوے اسٹیشن پر موجود نہیں ہے۔ لیکن پھر میں نے یہ سوچ کر خود کو تسکین دی کہ ہو سکتا ہے کہ میرا تار حمید کو ملا ہی نہ ہو۔ اس کا پتہ مجھے معلوم ہوتا تھا۔

قلی کے سر پر سامان رکھوا کر میں ہیلن کانچ کی طرف روانہ ہو گیا۔  
یہ بالکل اتفاق تھا کہ حمید مجھے کانچ کے دروازے پر ہی مل گیا۔ مجھے اپنے دروازے پر کھڑا دیکھ کر پہلے تو حمید مجھے حیرت بھری نظروں سے دیکھتا رہا جیسے اسے میری موجودگی پر یقین نہ آرہا ہو اور اسکے بعد دوڑ کر اس طرح مجھ سے لپٹ گیا کہ میرا سارا غصہ جاتا رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا تار ہی اسے نہیں ملا تھا۔ بھلاب انہیں کیسے قصور وار ٹھہرا سکتے تھے۔

مجھ سے خوشی کا اظہار کرنے کے بعد کہنے لگا۔  
”آج ہی تمہاری بھالی بھی آئی ہیں۔“ پھر وہ مجھے گھسیٹتا ہوا اپنے گھر کے اندر لے گیا۔

آپ میری حیرت کا انداز لگا ہی نہیں سکتے جب میں نے یہ دیکھا کہ گاڑی میں تمام رات جو عورت ملی بن کر میرے اعصاب پر چھائی رہی ہے وہ میرے دوست کی بیوی ہی تھی۔ جسے اس وقت میں اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔ بلاشبہ یہ وہی قیامت خیز عورت تھی۔  
ناہید کو دیکھتے ہی مجھے وہ سیاہ ملی پھر یاد آگئی جو ناہید کی بجائے اس کے بستر پر سو رہی تھی اور جو مجلی کی روشنی پھیلتے ہی دوبارہ ملی سے ناہید میں تبدیل ہو گئی تھی۔ حمید نے ناہید سے میرا تعارف کرایا اور اسے بتایا کہ میں اس کا کتنا گرا دوست ہوں۔ لیکن ناہید گرم جوشی دکھانے کی بجائے اپنی سرد مہر آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی۔۔۔  
ایک ہلکی سی خفیف مسکراہٹ کے علاوہ اس کے چہرے پر کوئی تاثر پیدا نہیں ہوا۔  
سب سے زیادہ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ ناہید نے ذکر کیوں نہیں چھیڑا کہ وہ میرے ساتھ ایک ہی کمپارٹمنٹ میں کاٹھ گودام تک آئی ہے۔ ناہید کی انجانی مصلحت کے پیش نظر میں نے بھی حمید کے سامنے اس بات کا کوئی ذکر نہیں کیا کہ ناہید ٹرین میں میری ہمسفر تھی اور میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسے ملی سے عورت میں تبدیل ہوتے دیکھا ہے۔

البتہ میں ناہید سے ڈر ضرور گیا۔۔۔ اور یہیں سے ایک عجیب و غریب کہانی شروع ہو گئی جسے آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔

میری اور ناہید کے بیک وقت آمد سے حمید واقعی بے حد خوش ہوا اس نے بتایا کہ بعض سرکاری فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں وہ ایک ہفتہ پہلے ہی جھگل پور سے روانہ ہو گیا تھا، اس لیے ناہید اس کے ساتھ نہ آسکی جس کا بہت رنج ہوا۔  
دوپہر کا کھانا ہم تینوں نے ایک ساتھ کھایا۔ کھانے کے دوران میں ہم دونوں

دوست ماضی کی حسین یادوں کا تذکرہ کرتے رہے محسن کی بہت ساری باتیں ایک دوسرے کو یاد دلاتے رہے۔ میں نے دیکھا کہ ناہید نے ہماری اس گفتگو میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔ اس کے برعکس وہ کبھی کبھی گہری نظروں سے میری طرف ضرور دیکھ لیتی تھی۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں لیکن میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ جب بھی ناہید میری طرف دیکھتی میں ایسا محسوس کرتا جیسے واقعی ناہید کے بجائے ایک بی میری طرف دیکھ رہی ہے۔

انسان کے برعکس بی کی آنکھیں بڑی دیر بعد جھپکتی ہیں۔ بالکل یہی انداز ناہید کی آنکھوں کا بھی تھا وہ جب بھی دیکھتی تو بلاشبہ بڑی دیر تک اس کی نگاہیں جھپکے بغیر ساکن و جامد نظر آتی رہتیں۔ میرے دل میں چور تو تھا ہی، میں بار بار اس کی آنکھوں کی طرف دیکھتا اور پھر نظریں چرا لیتا اس کے بعد نظر ملانے کی میری ہمت نہ پڑتی۔

رات کے کھانے کے بعد ہم تینوں نینی تال کے فلیٹ سے گھومنے کے لئے نکل گئے واپسی پر پہاڑی گلیاروں پر گھپ اندھیرا تھا۔ میں اور حمید سنبھل سنبھل کر قدم اٹھا رہے تھے۔ لیکن ناہید اس طرح سکون و اطمینان سے قدم اٹھا رہی تھی جیسے وہ یا تو اندھیرے میں بھی دیکھ رہی ہو یا اپنے جانے پہچانے راستے پر چل رہی ہو۔ لیکن حقیقت پوچھئے تو راستہ اس کا جانا پہچانا تھا نہیں۔ کیونکہ میری طرح وہ بھی عمر میں پہلی بار نینی تال آئی تھی۔ البتہ وہ عام انسانی آنکھ کے بالکل برعکس اندھیرے میں ضرور دیکھ رہی تھی۔

”ایک جگہ میں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اس کی آنکھیں دن کے مقابلے میں اس وقت زیادہ چمکتی نظر آرہی ہیں۔۔۔ بالکل اسی طرح جیسے بی کی آنکھیں اندھیرے میں چمکتی ہیں۔ میں یہ سب کچھ نوٹ کرتا جا رہا تھا اس کے برعکس حمید اپنی دھن میں بڑھا چلا جا رہا تھا۔

ناہید کی چمکتی آنکھوں نے مجھے ناہید کے وجود سے اور بھی زیادہ ڈرا دیا۔ لیکن میرے خیال میں حمید ناہید کی ان انسانی آنکھوں کے وجود سے بے خبر تھا۔ شاید وہ ناہید کی ان غیر معمولی آنکھوں کی چمک کو اس کی خوبصورتی سمجھتا تھا۔ ایک ایسی انفرادی خوبصورتی جو اس کی محبوب بیوی کے علاوہ دنیا کی کسی عورت کی آنکھوں میں نہیں تھی۔

ہیلن کانچ آنے کے بعد میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ حمید اور ناہید اپنے کمرے میں پہنچ گئے۔ دونوں کمروں کے درمیان صرف ایک لکڑی کی دیوار تھی اور اس دیوار میں ایک دروازہ بھی موجود تھا ہم دونوں نے اپنی اپنی طرف سے اس دروازے میں

کنڈی لگادی۔

بستر پر لیٹنے کے بعد بھی کافی رات تک مجھے نیند نہ آئی۔ میرے اعصاب پر ملی کا وجود کچھ اس طرح سوار ہو چکا تھا کہ میں جس طرف بھی دیکھتا مجھے ناہید کی آنکھیں ہی گھورتی دکھائی دیتیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ میرے وجود پر مکمل طور پر غلبہ حاصل کرنا چاہتی ہو۔

میرے خوف و دہشت کا اندازہ آپ لگا ہی نہیں سکتے۔ آپ جو قانون کے محافظ اور قانون کے علمبردار ہیں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ جب رات کو دو بجے کے بعد میری آنکھ ایک ملی کی دردناک چیخیں سن کر کھلی ہوگی تو میرے دل و دماغ پر کیا ہتھی ہوگی۔

رات کے دو بجے میری آنکھ کھلی۔ ہیلن کانٹج کے برآمدے میں ایک ملی رو رہی تھی۔ آپ میں سے اکثر نے رات کے سناٹے میں ملی کی دردناک چیخیں ضرور سنی ہوں گی۔ اور آپ کو یہ روایت بھی معلوم ہوگی کہ ہمارے معاشرے میں ملی کے رونے کو کتنا منحوس سمجھا جاتا ہے۔ تقریباً دس منٹ تک میں ان منحوس اور رو گھٹے کھڑے کرنے والی چیخوں کو سنتا رہا اور بستر میں دبکا لیٹا رہا۔ آوازیں بند ہونے کے بعد بھی کافی دیر تک مجھے نیند نہ آئی۔ نیند آتی بھی تو کیسے؟۔۔۔ گزشتہ دو راتوں سے ایک ملی ایک مافوق الفطرت وجود بن کر میرے اعصاب پر چھاتی جا رہی تھی۔

کوشش کے باوجود میں حمید سے اس کا تذکرہ نہ کر پایا۔ کیونکہ ناہید سے اپنے دوست کی بے پناہ چاہت کے جذبے نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ اگر میں نے حمید کو حقیقت بتلا بھی دی تو وہ یقین نہیں کرے گا۔۔۔ پھر دوسری بات یہ کہ میری بات کے افشاء سے دونوں میاں بیوی کی زندگیوں میں ایک زلزلہ سا آجاتا۔ اس لیے مصلحتاً میں خاموش رہا۔

اور حمید۔۔۔ وہ بدستور خوش تھا، ناہید کی محبت پر نازاں تھا اور نینی تال کی دلفریب گھاٹیوں میں ہر دن کو عید اور ہر رات کو شبِ برات سمجھ رہا تھا۔ اس کے چہرے ہرے سے عیاں ہوتا تھا کہ وہ بیوی کے روپ میں ناہید کو پا کر اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتا ہے۔

اس کے برعکس حمید کے چہرے پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ دیکھ کر میں البتہ یہ ضرور سوچا کرتا کہ آخر وہ خوش کیوں ہے؟۔۔۔ وہ ناہید کو خدا کی دی ہوئی سب سے بڑی نعمت کیوں سمجھ رہا ہے؟۔۔۔ یہ ٹھیک ہے کہ ناہید خوبصورت ہے، حسین و جمیل و نازک



اندام ہے، ملکوتی حسن کی مالک ہے، اس کے خدو خال میں یونانیت ہے اس کے جسم میں اجنتا آرٹ ہے، اس کی آواز میں چڑیوں کی چکار ہے، کونکلوں کا رس ہے، لیکن وہ --- عورت ہی کب ہے؟

اور پھر میں سوچتا کہ جب دو ہی دن کے اندر مجھے ناہید کے بارے میں اس کی زندگی کا سب سے اہم راز معلوم ہو گیا تو پچھلے دو سال میں حمید کو یہ راز کیوں معلوم نہیں ہوا؟ میں نے سوچا، ہو سکتا ہے میں ہی کسی وہم میں مبتلا ہوں اور میں نے ناہید کے بارے میں جو رائے قائم کی ہے وہ شروع سے ہی غلط ہو؟ --- لیکن کیا ٹرین کے کمپارٹمنٹ میں میری آنکھوں نے دھوکا کھایا تھا؟ --- کیا واقعی رات کو ٹلی کی دردناک چیخیں میرے تصور ہی میں گونجی تھیں؟ --- میں اس مسئلے پر جتنا سوچتا اتنی ہی زیادہ میری الجھنیں بڑھتی جاتیں --- اتنی ہی میری قوت فیصلہ جواب دیتی جاتی اور اتنی ہی میری قوت فکر مفلوج ہوتی جاتی۔

ایک دن اور اسی طرح بیت گیا۔

رات آئی تو اپنے ساتھ خوف و دہشت کی ایک نئی لہر لیتی آئی۔ کھانا کھانے کے بعد میں حمید کو اپنے کمرے میں لے آیا۔ --- سوچ سوچ کر میرے دل میں ایک طوفان ساہوا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں ناہید کے مسئلے پر حمید سے کچھ نہ کچھ بات ضرور کروں گا۔ کافی دیر تک ہم دونوں نینی تال کی دلفریبیوں اور وہاں کے حسین مناظر پر بات کرتے رہے۔

”تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔؟“ گفتگو کے دوران اچانک حمید نے مجھ سے سوال کیا۔ شاید اس نے میری مسلسل خاموشی سے یہ اندازہ لگالیا تھا۔

”نہیں دوست --- ایسی کوئی بات نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”لیکن تم نے یہ بات کیوں پوچھی؟ کیا میں نے تم سے کوئی شکایت کی ہے۔؟“

”یہ بات نہیں۔۔“ حمید نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ناہید نے مجھ سے تذکرہ کیا تھا کہ تم کچھ مجھے مجھے سے نظر آتے ہو، اور ہر وقت تمہاری آنکھوں سے ایک انجانا خوف ٹپکتا رہتا ہے۔ اس لیے ناہید کی بات پر مجھے تشویش ہوئی اور میں نے تم سے پوچھا۔“

اس کے چہرے پر فکر مندی کے آثار تھے۔

”یہ ناہید کا وہم ہے۔“ میں نے جھوٹ بولنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔ لیکن اس کے بعد خود ہی سوال کیا۔ ”حمید، کل رات کو تم نے مکان میں کسی ٹلی کے رونے کی آواز سنی تھی۔ ادھی رات کے قریب۔۔؟“

”نہیں تو.....“ حمید نے جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت کے آثار نمایاں تھے۔ کیونکہ میرے پوچھنے پر وہ بُری طرح چونک پڑا تھا۔ میرے چہرے کو دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”لیکن کیا تم نے سنی تھی.....؟“

”ہاں۔۔۔ رات کو دو بجے کے بعد کانچ کے صحن میں کوئی ہلی رورہی تھی۔ اور میں بیان نہیں کر سکتا حمید کہ اس کی چیخیں کتنی بھیانک تھیں۔“ یہ بتائے ہوئے بھی مجھ پر خوف طاری ہونے لگا تھا۔

”تم نے خواب دیکھا ہو گا ظفر۔۔۔“ حمید نے جواب میں کہا۔ ”کل چونکہ نینی تال میں ناہید کی پہلی رات تھی اور چونکہ ہم دونوں ایک ہفتے کی جدائی کے بعد ملے تھے اس لیے ساری رات ہم دونوں ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے تھے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں ہم دونوں ایک منٹ کے لیے بھی نہیں سوئے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ہلی کی چیخیں تم نے سنی ہوں اور میں نے نہ سنی ہوں۔“ حمید کے لہجے میں بے یقینی کی کیفیت تھی جو اس کے چہرے سے عیاں تھا۔

حمید کے اس جواب نے میرے ذہن کو سکون دینے کی بجائے اور زیادہ منتشر کر دیا۔ ذہنی طور پر میں ایک مرتبہ پھر غور کرنے کے لیے مجبور ہو گیا کہ کہیں واقعی میں شدید طور پر ہلی کے وہم میں تو مبتلا نہیں ہو گیا ہوں۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا۔ اب آپ ہی سوچئے کہ ٹرین کے کمپارٹمنٹ میں جب میں نے عورت کی جگہ ایک ہلی کو دیکھا اور اس کے بعد جو میری چیخ نکلی تو اتنی ہی دیر میں وہ ہلی ایک عورت میں بدل گئی۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟

نینی تال کی دوسری رات بالکل سکون سے گزر گئی۔ کوئی خاص واقعہ پیش نہیں

آیا۔!



ناہید واقعی ایک مثالی عورت تھی۔ دو ہی دن میں اس نے ہیلن کانٹج کی صفائی کر کے اس کو ایک سجا سجا مکان بنا دیا۔ ہر چیز قرینے سے رکھ دی۔ کھڑکیوں پر پردے لٹکا دیئے۔ دروازوں کے شیشے چمکا دیئے۔ گلدانوں میں پھول رکھ دیئے اور ہیلن کانٹج کو ایک خوبصورت رہائشی بنگلے میں تبدیل کر دیا۔

اس نے میری عدم موجودگی میں میرا کمرہ بھی سجا دیا تھا۔ دوپہر کے بعد جب میں آرام کرنے کے لیے اپنے کمرے میں داخل ہوا تو اس کی سادہ سجاوٹ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ سب سے زیادہ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ ناہید نے میرے کمرے میں اگر ہتی سلگا کر کمرے کو مہکا دیا تھا۔ خوشبو اتنی جان افزا اتنی کیف آور تھی کہ میں پلنگ پر لیٹتے ہی نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ کاروباری زندگی کی وجہ سے میں دن میں سونے کا عادی نہ تھا۔ چنانچہ مجھے انتہائی حیرت تھی کہ میں کیسے سویا اور مجھے نیند کیوں آئی؟

مسلسل ٹین گھنٹے تک میں گہری نیند سوتا رہا۔ آنکھ کھلی تو حمید میرے سرہانے کھڑا سہ پہر کی چائے کے لیے مجھے جگا رہا تھا۔ چنانچہ بستر سے اٹھ کر میں سیدھے باتھ روم چلا گیا۔ منہ ہاتھ دھو کر تیاری کر لی اور باہر نکل آیا۔ چائے پر ہم تینوں اکٹھے تھے۔ اس دوران حمید مجھ سے اوپر اوپر کی باتیں کرتا رہا۔ چائے پینے کے بعد ہم تینوں اسنو ویو دیکھنے چلے گئے۔

میں نے محسوس کیا کہ آج خلاف معمول ناہید بے حد خوش ہے۔ آج وہ مجھ سے گھل مل کر باتیں بھی کر رہی تھی۔ لیکن میرے بارے میں، کبھی میرے کاروبار کے بارے میں، کبھی میری اور حمید کی دوستی کے بارے میں اور کبھی میری ہونے والی بیوی

کے بارے میں۔ باتوں کا ایک طویل سلسلہ تھا جو ختم ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔ اسے حیرت تھی کہ میں نے اب تک اپنی شادی کیوں نہیں کی؟ کیا مجھ میں کوئی کمی تھی یا لڑکی نہیں مل رہی تھی۔

اسنوویو جانے والے پہاڑی پیچ دار راستے پر اکثر وہ میرے چہرے کی طرف بھی غور سے دیکھتی۔ اس دوران میری اور اس کی نظریں مل جاتیں اور میں یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ واقعی ملی اور اس کی آنکھوں میں کوئی فرق نہیں ہے وہی سحر آگیاں آنکھیں۔۔۔ وہ آنکھیں جن کی ایک ہی جھلک آدمی کو بدحواس کر دیتی ہے۔ اور خوف و دہشت کی ایک تیز لہر جسم کی رگوں میں دوڑا دیتی ہے۔

آج ناہید مجھ میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہی تھی۔ ایسی دلچسپی جو ہندرج بے تکلفی میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا بار بار دل فریب کا فرانہ انداز سے میری طرف دیکھنا، آنکھیں مٹکا مٹکا کر دلفریب اداؤں کا مظاہرہ کرنا ایک نئی بات تھی۔

شام کے قریب ہم سنوویو سے واپس روانہ ہوئے۔ ابھی سورج کی سرخی باقی تھی۔ ہم چاہتے تھے کہ اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی اپنے کانٹ پھینچ جائیں۔ لیکن راستے میں ایک ایسا حادثہ پیش آگیا جس نے ایک مرتبہ پھر میرے وہم کو یقین میں بدل دیا۔ بات ہی ایسی تھی۔

نا معلوم کہاں سے ایک بلا دوڑتا ہوا ہمارے قریب آیا اور ہمارے سامنے اس طرح کھڑا ہو کر کہ ہمارا راستہ رک جائے غرانے لگا، لیکن اس کے اس غرانے میں کوئی غصہ نہیں تھا، کوئی جارحانہ ارادہ نہ تھا، بس وہ اس طرح غرار رہا تھا جیسے وہ اپنی کسی ہم جنس کو دیکھ کر باتیں کرنا چاہتا ہو۔ حمید نے محسوس کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن میں نے ضرور محسوس کر لیا کہ یہ بلا صرف ناہید ہی کے قدموں میں کیوں لوٹ رہا ہے۔ وہ ہماری طرف کیوں نہیں آیا؟

میرے دیکھتے ہی دیکھتے ناہید نے پہلے تو اس بلے کو ٹھو کریں ماریں اور جب وہ اس کے باوجود وہاں سے نہیں ٹلا تو اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کو اٹھا کر دور پھینک دیا۔ غصہ سے ناہید کا منہ لال ہو گیا تھا اور آنکھیں سرخ تھیں۔

ناہید کے چہرے کی یہ تبدیلی بھی میں نے ہی محسوس کی۔ حمید نے اس کا روائی کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ وہ برابر آگے بڑھتا رہا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

بلے کو اچھالنے کے بعد ناہید حمید کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ میں بھی ان کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ تقریباً دس گز چلنے کے بعد اس نے مڑ کر دیکھا۔ بلا

دوبارہ دوڑتا ہوا اس کی طرف آ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر ناہید نے بھی اپنی رفتار تیز کر دی۔ اور حمید بھی اس کے ساتھ ساتھ تیزی سے چلنے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ آگے نکل جائیں، بلا چھلانگ مار کر دوبارہ ان کے سامنے آ گیا۔ اور اس مرتبہ بے کے تیور کچھ زیادہ ہی بد لے ہوئے تھے۔ ارادے خطرناک لگ رہے تھے۔ چنانچہ سامنے آتے ہی اس نے اچھل کر ناہید کو پنچے مارنا چاہے۔ حمید کے ہاتھ میں چھڑی تھی، اس نے پوری طاقت سے بے پر وار کیا اور ایک بھیانک چیخ کے ساتھ بلا زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

بلا مرا نہیں تھا، صرف شدید طور پر زخمی ہو گیا تھا۔ اس کے سر پر چوٹ لگی تھی اور زخم سے خون بہہ رہا تھا۔

”اس بے نے تو جیسے ہمارا پیچھا ہی لے لیا تھا۔“ حمید نے زخمی بے کی طرف حقارت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اور ناہید کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ گیا۔ ناہید خاموشی سے چلتی رہی۔ اب غالباً زخمی بے میں اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ وہ گردن اٹھا کر ہم لوگوں کی طرف دیکھ بھی سکتا۔ پندرہ منٹ کے اندر ہم ہیلن کانٹج پہنچ گئے۔

ناہید کی ساری مسرت اور ساری بغاشت رخصت ہو چکی تھی۔ اس کو تو جیسے چپ سی لگ گئی تھی۔ جیسے اسے کوئی دلی صدمہ پہنچا ہو۔ ایک ایسا صدمہ جسے وہ زبان پر بھی نہ لاسکتی ہو۔ چہرے پر مردنی سی چھا گئی تھی۔

رات کا کھانا بھی اس نے انتہائی بے دلی سے کھایا۔ ماحول پر ایک عجیب سی بے لطفی طاری رہی۔ کھانا ختم ہوتے ہی وہ مجھے اور حمید کو باتیں کرتا چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ حمید نے اس کے بدلے ہوئے رویے کو اس کی نرم دلی سے تعبیر کیا۔ لیکن میرا ذہن حمید کے اس نظریہ کو تسلیم کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔

ناہید ایک مرتبہ پھر میرے لیے بھید بن چکی تھی! میں چونکہ اپنی عادت کے برعکس دن میں بالکل سونے کا عادی نہیں تھا اور معمول کے خلاف آج دن میں کئی گھنٹہ سوچا تھا اس لیے لازماً مجھے کافی رات تک نیند نہ آئی۔۔۔ نیند بھی نہیں آئی اور میرا دماغ بھی دن اور شام کے واقعات کے تانے بانے میں الجھا رہا۔ پہلی بات تو میرے ذہن میں یہ کھٹکتی رہی کہ ناہید نے میرے کمرے کو خوشبو سے معطر کیوں کیا اور دوسری بات وہی شام والا بلا جو ناہید کے قدموں پر اس طرح لوٹ رہا تھا جیسے اسکے قدموں میں اس کو سب سے بڑی دولت مل گئی ہو۔

اسی طرح رات کے بارہ بج گئے۔ نیند اب بھی میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بستر سے اٹھ کر میں کھڑکی میں آکھڑا ہوا گیا جہاں سے ہیلن کانٹج کا پچھلا صحن اور باغیچہ بھی

دکھائی دیتا تھا اور دور کی پہاڑیاں بھی۔۔ میں رات کے اس منظر میں بڑے انہماک سے کھویا ہوا تھا۔

چاندنی رات میں خاموش پہاڑی ماحول کا یہ منظر اتنا رومان انگیز تھا کہ میں اس کے سحر میں ڈوب کر رہ گیا۔ اس کی دلفریبی نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں کمرے سے باہر نکل کر پہاڑ کی چاندنی رات کا پورا لطف اٹھا لوں۔ چنانچہ میرے قدم بے اختیار دروازے کی طرف بڑھے۔

میں نے دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ باہر آکر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ لیکن باہر نکلتے ہی میرے قدم جیسے جم کر رہ گئے۔ میں نے دیکھا کہ وہی 'سنوویو' کے راستے میں حمید کے ہاتھوں زخمی ہونے والا بلا کاٹج کے برآمدے سے اتر کر صحن کی طرف جا رہا ہے۔ اس بلے کو میں اس لیے فوراً پہچان گیا کہ اس کا رنگ بالکل دودھ کی طرح سفید تھا۔



اس وقت راہداری میں ملگجی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ جب یہ سفید بلا برآمدے اور راہداری سے گزرتا ہوا صحن میں آیا تو یہ دیکھ کر میری حیرت میں اور اضافہ ہو گیا کہ زخمی بلے کے سر پر باقاعدہ پٹی بندھی ہوئی تھی۔ بالکل ایسی پٹی جیسی ڈاکٹر چوٹ یا زخم پر دوا لگا کر باندھ دیتے ہیں۔ زخمی بلے کو اس حالت میں دیکھ کر میں نے محسوس کیا جیسے میری رگوں میں خون جمنا جا رہا ہے۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ناہید زخمی بلے کی اتنی محبت اور شفقت سے مرہم پٹی کرے گی۔ میرے لیے ایک سوال یہ بھی تھا کہ زخمی بلا یہاں آیا کیسے؟ میرے خیال میں اس کا صرف ایک ہی جواب تھا۔ حمید کے سو جانے کے بعد ناہید خود جا کر اس زخمی بلے کو اٹھا کر لائی ہوگی۔ میں نے سوچا۔ یہ مرہم پٹی ایک بلی نے ایک بلے کی کی تھی۔ یا ایک عورت نے ہمدردی کے جذبے کے تحت بلے کے زخموں پر مرہم رکھ کر اس کو آرام پہنچانا چاہا تھا۔

وہ رات مجھے جاگتے ہی گزر گئی۔ تمام رات میں سیاہ بلی اور سفید بلے کے تصور میں

ڈوب رہا۔ ایک ایک کر کے وہ تمام واقعات مجھے یاد آتے گئے جو میں نے سیاہ بلیوں کے بارے میں اب تک پڑھے یا سنے تھے۔ ایسے واقعات جن کا تصور کرتے ہی رو گھٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔

میں سوچنے لگا کہیں یہ بلی جو اس وقت میرے لیے وقت کا سب سے بڑا اسرار بنی ہوئی ہے۔ ان بلیوں میں سے تو نہیں جو رات کی تاریکی میں اپنا روپ بدل لیتی ہیں جو بھسکی ہوئی روحیں ہوتی ہیں، جو انسانی خون کی پیاسی ہوتی ہیں۔ اور جن کی سرخ اور خوفناک آنکھوں سے خبیث ارادے جھانکتے رہتے ہیں۔

ہمارے سماج میں بلی کو ہمیشہ سے پر اسرار حیثیت حاصل رہی ہے۔ بلی کا وجود مچھن سے ہمارے ذہنوں میں ایک خوف و دہشت کی علامت بن کر سمایا رہتا ہے۔ یہی حال میرا بھی تھا، میں بھی بلی کو ایک مافوق الفطرت حیوان سمجھتا تھا۔

میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور پھر کہتا ہوں کہ میں وہمی نہیں ہوں۔ میں بھوت پریت اور بدروحوں کا قائل نہیں ہوں لیکن نینی تال کی اس سیاہ بلی نے میرے ذہن میں سوئے ہوئے تمام توہمات کو زندہ کر دیا۔ اور میں ایک بار پھر اس قسم کے تانوں بانوں میں الجھ کر رہ گیا۔

اور مجھے ایک اور بلی یاد آگئی۔

میرے والد نے میرے زمانہ طالب علمی میں ایک پرانی حویلی خریدی تھی۔ اس حویلی کے بارے میں مشہور تھا کہ وہاں بھوت رہتے ہیں۔ اور اس کے بعض کمرے روحوں کا مسکن ہیں۔ میرے والدین کہانیوں پر بالکل یقین نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے دوستوں اور عزیزوں کی مخالفت کے باوجود یہ حویلی خرید لی اور اس میں منتقل ہو گئے۔ انہیں یہ پرانی حویلی بے حد پسند تھی۔ پسندیدگی کا ایک پس منظر یہ بھی تھا کہ یہ حویلی ان کے ایک دوست کی تھی اور دوست کی موت کے بعد اس کے وارثوں نے اس کو ویران چھوڑ دیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس حویلی میں منتقل ہونے کے تین دن بعد ہی ہمیں وہاں ایک سیاہ بلی دکھائی دی اور میرے والد اس بلی کو دیکھ کر چونک سے گئے۔ کیونکہ یہ ان کے مرحوم دوست کی پالتو بلی تھی۔

میرے والد کو دیکھتے ہی بلی چھلانگ لگاتی ہوئی آئی اور ان کے قدموں میں لوٹنے لگی۔ ہم اس کی حرکت پر حیران ہو کر رہ گئے۔

چند دن کے اندر یہ بلی ہم سب کی زندگی کا جزو بن گئی۔ وہ ہمارے ساتھ کھیلتی، ہمارے ساتھ گھومتی، ہمارے ساتھ کھانے کی میز پر بیٹھتی۔ لیکن رات آتے ہی وہ ہم

سب کو چھوڑ کر چلی جاتی۔ پھر صبح تک اس کا کوئی پتہ نہ چلتا۔ البتہ رات کو اس کے رونے یا چیخنے کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوتی۔ چیخیں اتنی لرزہ خیز ہوتیں کہ ہم ان کو سنتے ہی اپنے اپنے بستروں میں دبک جاتے۔ میری والدہ ٹھیٹھ قسم کی مشرقی عورت تھیں۔ انہیں روزاول سے ہی یہ بلی ناپسند تھی اور وہ کئی مرتبہ والد صاحب سے کہہ بھی چکی تھیں کہ اس بلی کی کہیں دور پھنکو ادیا جائے۔ شروع میں تو والد صاحب نے ان کا مشورہ نہیں مانا۔ لیکن ہم بچوں کی سلامتی کے نام پر آخر ایک دن انہوں نے اس بلی کو ایک نوکر کے ذریعہ تقریباً سو میل دور جنگل میں پھنکو ادیا۔ چار دن تک ہماری راتیں پر سکون گزریں۔ کیونکہ اب بلی کی چیخیں ہماری راتوں کی نیند حرام نہیں کرتی تھیں۔ ہم نے سکھ کا سانس لیا۔

لیکن۔۔۔ ایک رات جب ہم سب سکون کی نیند سو رہے تھے، اچانک بلی کی جانی پہچانی چیخیں ہمارے کانوں میں پہنچیں۔ وہی درد و کرب میں ڈوبی ہوئی چیخیں۔ آج یہ چیخیں اتنی بھیانک تھیں کہ میرے والد تک اپنے کمرے سے باہر آ گئے۔ ان کے ساتھ ہم لوگ بھی باہر چلے آئے۔

ہم سب نے حویلی میں بلی کی تلاش شروع کر دی۔  
بلی حویلی کے کسی کمرے میں نہیں تھی۔ لیکن اس کی چیخیں بدستور آرہی تھی۔ آخر والد صاحب نے انداز لگا ہی لیا کہ یہ چیخیں ایک کمرے سے آرہی تھیں۔ لیکن بلی اس کمرے میں بھی نہیں تھی۔

دیر تک میرے والد خوف اور حیرت کے ملے جلے جذبے کے ساتھ اس بند کمرے میں کھڑے ہو کر بلی کی چیخیں سنتے رہے اور ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ جب بلی اس کمرے میں نظر نہیں آرہی ہے تو اس کی چیخیں کہاں سے آرہی ہیں۔ یہ سوچ کر ہم سب حیران و پریشان ہو رہے تھے۔

اور پھر۔۔۔ انہوں نے نوکروں کو حکم دیا کہ اس کمرے کی مشرقی دیوار کو توڑا جائے، کیونکہ آواز اسی دیوار سے آرہی تھی۔ چنانچہ تمام نوکروں نے فوراً حکم کی تعمیل میں یہ کام انجام دینا شروع کر دیا۔

ایک گھنٹے کی مسلسل جدوجہد کے بعد یہ دیوار توڑ ڈالی گئی۔۔۔ اور اس کے بعد جو کچھ ہمیں نظر آیا اسے دیکھ کر دنیا میں کوئی شخص ہم سب کی حیرت کا اندازہ لگا ہی نہیں سکتا۔ ہم نے دیکھا کہ اس دیوار کے اندر ایک خول تھا۔ خول میں ایک انسانی پنجر تھا۔ اور سیاہ بلی اسی انسانی پنجر کے قدموں کے نیچے بیٹھی رو رہی ہے۔



منظر اتنا بھیانک تھا کہ ہم سب کی کھجھی بندھ گئی۔ ہر شخص خوف کے مارے تھر تھر کانپنے لگا تھا۔ میرا حال بھی براتھا۔

والد صاحب نے اسی وقت پولیس کو طلب کر لیا۔ پولیس نے وہاں پہنچتے ہی اس انسانی پنجر پر قبضہ کرنے کے بعد تحقیقات شروع کی کہ یہ پنجر کس کا ہو سکتا ہے۔ مجھے نہیں یاد کہ اس کے بعد کیا ہوا؟ تحقیقات کا نتیجہ کہاں تک پہنچا۔ پنجر کا کوئی سراغ ملایا نہیں۔ لیکن مجھے اتنا یاد ہے کہ اس دن کے بعد یہ ملی از خود غائب ہو گئی اور پھر اس حویلی میں کبھی دکھائی نہیں دی۔

میں یہ واقعہ ہر گز بیان نہ کرتا۔ بظاہر اس واقعہ کا موجودہ حادثہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن دراصل یہ واقعہ بیان کر کے میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ ملی ایک مافوق الفطرت حیوان ہے۔ ایک بھیانک وجود جو اپنا روپ بدل سکتا ہے اور جو اپنے مقصد کی تکمیل کی خاطر اپنی طبعی عمر گزر جانے کے بعد بھی زندہ رہ سکتا ہے کیونکہ اس کی بے شمار مثالیں اب تک سامنے آچکی ہیں۔

تمام رات مجھے گزرے ہوئے واقعات یاد آتے رہے۔ اور ان واقعات کے تانے بانے ملا کر میں ناہید کی پر اسرار شخصیت کے بارے میں سوچتا رہا، جو بہر حال وقت کا سب سے بڑا اسرار بن کر میرے سامنے ایک سوالیہ نشان بنی کھڑی تھی۔ ساری رات اسی نقش کش میں گزر گئی۔

صبح کو ناشتے کی میز پر میں نے کنکھیوں سے ناہید کے چہرے کی طرف دیکھا اس کا چہرہ کسی قسم کے جذبات اور احساسات سے بالکل خالی تھا۔ لیکن دلی دلی کوئی خوشی چہرے کو دمکائے ہوئے تھی۔ بے کے حادثے کے بعد جس اداسی نے اس کے خوبصورت چہرے پر ڈیرہ جمالیا تھا اس کا اب دور دور تک کوئی پتہ نہ تھا۔

لیکن اب میں بھی فیصلہ کر چکا تھا کہ میں ناہید کی شخصیت میں چھپا ہوا یہ بھید معلوم کر کے ہی دم لوں گا۔ اس دن میں سردرد کا بہانہ کر کے تمام دن اپنے کمرے میں بند رہا اور خوب جی بھر کر سویا۔ تمام دن سوتے رہنے سے میرا مقصد یہ تھا کہ میں تمام رات جاگ سکوں۔ کیونکہ میں رات بھر جاگ کر ناہید کی نگرانی کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح شاید میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا۔

اور اس طرح نین تال کی چوتھی رات شروع ہو گئی۔ چوتھی پر اسرار اور بھیانک رات۔۔۔

رات کو نو بجے میں نے اپنے کمرے کی ہتی بچھا دی تاکہ یہ سمجھ لیا جائے کہ میں سو

چکا ہوں اور پھر بستر پر لیٹ کر زیادہ رات ہو جانے کا انتظار کرتا رہا۔ گیارہ بجے میں نے اپنے کمرے کا دروازہ بڑی آہستگی سے کھولا۔ اور پھر دبے پاؤں برآمدہ پار کر کے کانچ کی ایک جھاڑی میں چھپ گیا۔ اس جھاڑی سے مجھے پوری کانچ خولی نظر آرہی تھی۔

چاند آسمان کی وسعتوں پر ابھر چکا تھا۔ شفاف چاندنی میں دور دور تک کی چیزیں بالکل صاف اور واضح نظر آرہی تھیں۔ میں دم سادھے جھاڑی میں بیٹھا آنے والے واقعات کا انتظار کر رہا تھا۔ کیونکہ مجھے پورا یقین تھا کہ کل کی طرح آج رات بھی یا تو خود ناہید زخمی بلے کی پٹیاں بدلنے کے لیے کانچ کے باہر جائے گی یا پھر زخمی بلا خود ہی یہاں آ جائے گا۔

اچانک میری توقعات پوری ہو گئیں۔

میں نے دیکھا کہ سفید بلا کانچ کے باہر نظر آیا۔ چند لمحوں بعد وہ میری دیوار پھاند کر وسیع صحن میں داخل ہو رہا ہے۔ کپڑے کی پٹی اب بھی اس کے سر کے زخم پر بندھی ہوئی تھی۔ اس نے سیدھا ناہید کے کمرے کا رخ کیا۔ قدموں میں بڑی سست روی تھی۔ برآمدے کے قریب پہنچ کر وہ رکا اور چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے انتہائی ہلکی آواز میں ایک مخصوص قسم کی آواز نکالی۔

اس طرح چند لمحے انتظار میں گزر گئے۔

دومنٹ کے اندر ناہید کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ پھر ناہید کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس نے بڑی احتیاط سے جھانک کر ادھر ادھر دیکھا جیسے وہ یہ اطمینان کر رہی ہو کہ کوئی اور اسے دیکھ تو نہیں رہا ہے اور پھر خود بھی دبے پاؤں برآمدے کی سیڑھیوں سے اتر کر بلے کے قریب پہنچ گئی۔ اس کے بعد میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے بلے کو بڑے پیار سے اٹھ کر گود میں لے لیا۔ پھر فوراً محبت سے اسے چومنے لگی۔ ایک بلے کے ساتھ اس کی محبت اور وارفتگی کا یہ عالم دیکھ کر میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

ناہید بڑی دیر تک بلے کو گود میں لیے کانچ کے وسیع صحن میں ٹہلتی رہی، پیار سے اس کے سر اور جسم پر ہاتھ پھیرتی رہی۔۔۔ اور میں ایک بلے کے لیے اپنے دوست کی خوب صورت بیوی کی محبت اور شفقت کا یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ میری حیرت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ وقت اسی طرح تیزی سے گزرتا رہا۔ میں بھی محویت کے عالم میں کافی دیر تک اس نظارے سے لطف لیتا رہا۔ اچانک ناہید بلے کو لے کر اندھیری جھاڑیوں کی طرف بڑھی اور چند ہی لمحوں بعد وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اب میں نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے۔ ہر

طرف خاموشی کا راج تھا۔

چند منٹ بعد میں نے جو کچھ دیکھا وہ صرف میرے ہی نہیں ہر اس آدمی کے روٹھے کھڑے کر دینے کے لیے کافی تھا جس نے میری طرح یہ منظر دیکھا ہوتا۔ بلاشبہ وہ منظر ہی ایسا تھا۔

میں نے دیکھا کہ اب صحن کی پھیلی ہوئی چاندنی میں ایک نہیں بلکہ دو بلیاں موجود ہیں۔ ایک سفید بلا اور ایک کالی بلی۔ وہی کالی بلی جو ہر بلی سے کاٹھ گودام آتے وقت مجھے ٹرین میں ناہید کے بستر پر سوتی دکھائی دی تھی۔ دونوں پوری آزادی کے ساتھ ایک دوسرے سے کھیل رہے تھے۔ صحن کی گھاس پر لوٹ رہے تھے۔ ایک دوسرے کو ادائیں دکھا رہے تھے۔ ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹے تک ان کا یہ کھیل جاری رہا۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر وہ بڑی دلچسپی سے اپنے کھیل میں مشغول تھے۔ میں دونوں کا خاموش تماشائی بنا جھاڑی میں بیٹھا سارا کھیل دیکھتا رہا۔ میں حیران تھا کہ یہ کالی بلی کہاں سے آگئی۔ اور ناہید کہاں چلی گئی۔ حالانکہ وہ بے کے ساتھ ہی جھاڑیوں میں گئی تھی۔ پھر غائب کیسے ہوئی ٹرین کے سفر کے بعد میں نے دوبارہ کالی بلی کو نہیں دیکھا تھا۔ اس دن کے بعد آج اسے اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔ اسی اثناء میں چاند مشرق کی جانب ڈھلنا شروع ہو گیا۔ چاندنی صحن سے سرک کر دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ بلا اور بلی دونوں تاریکی میں آگئے۔ اس کے بعد میں دیکھ ہی نہ سکا کہ یہ دونوں کس طرف چلے گئے۔

ایک گھنٹے تک ان دونوں کی واپسی کا انتظار کرنے کے بعد میں تھک ہار کر جھاڑیوں کے اندر سے باہر نکلا اور خاموش قدموں کے ساتھ برآمدے کی سیڑھیوں پر چڑھ کر دوبارہ ان جھاڑیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اور پھر اندھیرا ہونے کے باوجود میں نے دیکھ لیا کہ جھاڑیوں میں سے دو آنکھیں چمک رہی ہیں۔ یہ آنکھیں اتنی بھیاںک اور اتنی ڈراؤنی تھیں کہ میں بالکل سحر زدہ ہو کر رہ گیا۔ خوف و دہشت کی ایک لہر میرے جسم میں دوڑنے لگی۔ پاؤں سو سو من کے ہو گئے۔

اُف۔۔۔ آج بھی جب میں ان آنکھوں کا تصور کرتا ہوں تو چند لمحات کے لیے میرے خون کی روانی رک جاتی ہے۔ میرے وہم و گمان سے بھی زیادہ دہشتناک آنکھیں تھیں۔ صرف دو منٹ کے اندر یہ سب کچھ ہو گیا۔ کیونکہ اس کے بعد یہ خوفناک آنکھیں خود خود اندھیرے میں غائب ہو گئیں۔

ناہید کے کمرے میں بدستور تاریکی طاری تھی۔!

صبح ناشتے کے وقت جب میں نے ناہید کی طرف دیکھا تو میں پہلی ہی نظر میں یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ ناہید کے خوبصورت چہرے پر ناخونوں کی چند ہلکی ہلکی خراشیں موجود ہیں۔ میں نے چاہا کہ میں ناہید سے ان خراشوں کا سبب دریافت کروں۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ کیونکہ میں اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ ناہید کے پاس میرے سوال کا کوئی نہ کوئی معقول جواب ضرور موجود ہوگا۔ وہ جواب جو وہ پہلے ہی حمید کو دے چکی ہوگی۔ لہذا اس سلسلے میں کچھ کہنا اور پوچھنا بیکار تھا۔

میں نے حمید سے بھی رات والے واقعہ کا کوئی تذکرہ نہیں کیا اور محض اس لیے نہیں کیا کہ حمید میری کسی بات پر یقین نہیں کرے گا۔ میں ن سوچا حمید کا لا علم رہنا ہی بہتر ہے۔ کیونکہ بہت ممکن ہے کہ میری کہانی سننے کے بعد اس کی ازدواجی زندگی کی مسرتیں غم میں تبدیل ہو جائیں۔ یا وہ سرے سے میری بات کا یقین ہی نہ کرے۔ لیکن میں بہر حال اپنے اس فیصلے پر قائم تھا کہ میں ناہید کی زندگی کا یہ بھید معلوم کر کے ہی دم لوں گا۔ میں صرف ایک ہفتے کے لیے بمبئی سے نینی تال آیا تھا اور آج پانچ دن ہو چکے تھے۔ میری واپسی میں صرف دو دن باقی تھے۔ لیکن میں طے کر چکا تھا کہ خواہ مجھے نینی تال میں کتنے ہی دن کیوں نہ رکنا پڑے میں ناہید کی زندگی کا یہ راز معلوم کر کے ہی یہاں سے جاؤں گا۔ یہ میرا آخری فیصلہ تھا۔

میں سچ کہتا ہوں اگر مجھے یہ معلوم ہوا ہو تا کہ میرے اس فیصلے سے اتنے خطرناک اور بھیاں کن نتائج برآمد ہوں گے تو میں شاید اسی دن نینی تال چھوڑ دیتا اور واپس بمبئی چلا جاتا۔

میرے اعصاب پر ناہید کا وجود اس بری طرح چھایا ہوا تھا کہ جب حمید نے مجھ سے جھیل کی سیر کو چلنے کی دعوت دی میں نے انکار کر دیا۔ لیکن حمید نے میری کوئی دلیل نہ مانی۔ وہ مجھے زبردستی مجھے اپنے ساتھ لے گیا ناہید پہلے ہی ساتھ جانے سے انکار کر چکی تھی۔ کیونکہ اسے دوپہر کا کھانا تیار کرنا تھا۔ آج ناہید مجھ سے کچھ کھینچی کھینچی سی تھی اور اس کے رویہ کی یہ تبدیلی میں صبح ہی سے محسوس کر رہا تھا۔

حمید بدستور خوش تھا۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کی بے پناہ خوشی کا سبب یہ تھا کہ وہ ناہید کے بارے میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتا تھا کہ وہ اس کی خوب صورت اور محبت کرنے والی بیوی ہے۔ ایک بد صورت آدمی کی انتہائی خوب صورت بیوی۔ لیکن آج خود حمید نے اپنے بارے میں ایک نئی بات بتائی۔ اپنے بارے میں بھی اور اپنی بیوی ناہید کے بارے میں بھی۔ اس نے کہا۔

”تم نے مجھے شادی کے بعد پہلی مرتبہ دیکھا ہے اور شادی سے پہلے بھی کافی عرصے سے نہیں دیکھا تھا۔ میں بہت دبلا تھا ظفر اور میری صحت بھی کچھ اچھی نہیں تھی۔ لیکن شادی کے بعد مجھ میں حیرت انگیز تبدیلی آگئی۔ دن بہ دن میری صحت اچھی ہوتی گئی۔ میرا جسم پھولتا چلا گیا۔ رنگ و روپ بھی نکھر گیا اور آج تم مجھے خود اتنا تندرست و توانا دیکھ رہے ہو تو اس کا سبب صرف ناہید کی قربت اور اس کی محبت ہے، وہ مجھ سے دیوانہ وار محبت کرتی ہے ظفر اتنی محبت کہ اگر خدا نخواستہ وہ مجھ سے بچھڑ گئی تو میں سمجھتا ہوں میری موت واقع ہو جائے گی۔“

حمید کشتی کے چپو بھی چلاتا رہا اور ناہید کے بارے میں گفتگو بھی کرتا رہا۔ میں اس کی باتیں بڑی دلچسپی سے سن رہا تھا۔ کیونکہ اس طرح میں اپنے دوست کی نجی زندگی اور ناہید کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر سکتا تھا کچھ دیر توقف کے بعد اس نے مجھ سے مزید کہا۔

”ناہید بے حد خوبصورت ہے ظفر۔۔۔ بے حد خوب صورت اور بے حد جذباتی۔۔۔ لیکن ظفر اس میں ایک خرابی بھی ہے۔ ایک ایسی خرابی جو ایک بیوی کا شوہر ہی محسوس کر سکتا ہے۔“ چونکہ حمید میرا بے تکلف دوست تھا اس لیے اس نے ناہید کی یہ خرابی بیان کرنے میں کوئی حجاب محسوس نہیں کیا۔ اس نے کہا۔

”جب ناہید کپڑے اتار دیتی ہے تو اس کے جسم سے ایک عجیب قسم کی بدبو خارج ہوتی محسوس ہوتی ہے۔۔۔ ایک ایسی بدبو جو عموماً پالتو اور گھریلو بلیوں کے جسموں سے برآمد ہوتی ہے۔ میں نے اس کے جسم کی یہ بدبو ختم کرنے کے لیے اس کو قیمتی سے

قیمتی صابن لا کر دیئے۔ اس کے جسم پر خوشبودار پرفیوم کی مالش کرائی۔ دنیا بھر کی خوشبودار چیزوں کو آزما کر دیکھا۔ لیکن میری ہر ممکن کوشش کے باوجود اس کے جسم کی یہ بدبو ختم نہ ہوئی۔“

میں حمید کے اس انکشاف پر چونک کر رہ گیا۔ کیونکہ یہ میرے لیے ایک نئی بات تھی اور عجیب و غریب تھی۔ اس نے مجھ سے مزید کہا۔ ”میں نے اس کا ذکر اپنے شہر کے بہترین ڈاکٹروں سے بھی کیا، ان کا علاج بھی کرایا، ان کے مشوروں پر بھی عمل کیا، لیکن اس کے باوجود ناہید کے جسم سے نکلنے والی یہ بدبو ختم ہونا تھی نہ ہوئی۔“

میں حمید کی گفتگو سنتا رہا۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ کیونکہ اگر میں حمید کو ناہید کے جسم کی بدبو کا راز بتا بھی دیتا تو وہ میری بات کا ہر گز یقین نہ کرتا۔ لیکن حمید کے اس انکشاف کے بعد مجھے پورا یقین ہو گیا کہ میں کسی وہم میں مبتلا نہیں ہوں۔ اور جو میں نے انداز لگایا تھا وہ حقیقت پر مبنی تھا، یعنی ناہید ایک عورت کا نہیں کسی مافوق الفطرت وجود کا نام تھا جسے کسی صورت جھٹلایا نہیں جاسکتا ہے۔



جھیل کی سیر کے بعد جب ہم دونوں واپس آئے تو ہیلن کانچ کے قریب میں نے سفید بے کو دوبارہ دیکھ لیا۔ یقیناً وہ ہیلن کانچ سے ہی واپس آ رہا تھا۔ آج اس کے سر پر پٹی بھی نہیں بندھی ہوئی تھی۔ غالباً زخم مندمل ہو چکا تھا۔ سفید بلا حمید کو دیکھ کر دبک گیا اور ایک جھاڑی میں اس طرح چھپ گیا گویا وہ ارادی طور پر ہماری نگاہوں سے چھپنا چاہتا ہو۔

جب ہم لوگ کانچ میں داخل ہوئے تو ناہید کھانا تیار کر چکی تھی اور ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے انداز سے یہی پتہ چلتا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ کھانے کے انتظام میں لگ گئی۔

میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو ناہید کے وجود سے اسرار کا یہ پردہ اٹھا کر

ہی دم لوں گا، لیکن اہم سوال یہ تھا کہ میں پردہ دیکھ ہی کب رہا تھا؟ پردے پر میری گرفت ہی کب تھی؟

اس رات بھی میں سفید بے کی آمد کا انتظار کرتا رہا۔ آج میں چاہتا تھا کہ جب سفید بلا اور سیاہ ملی چاندنی رات میں ایک دوسرے سے کھیل رہے ہوں تو میں حمید کے کمرے میں جھانک کر یہ دیکھ لوں کہ ناہید اپنے بستر پر ہے یا نہیں۔؟

کالی ملی کا وجود ہر لمحہ میری نظر میں اس لیے بھیانک ہو تا جا رہا تھا کہ یہ ملی کل رات کے علاوہ مجھے آج تک ہیلن کانٹج میں دکھائی نہیں دی تھی۔ اور میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا کہ یہ ملی اگر واقعی صرف ملی ہے تو دن میں کہاں چھپی رہتی ہے؟

رات کے بارہ بجے تک میں بے کے انتظار میں جاگتا رہا۔ اور اس کے بعد تھک کر سو گیا۔ لیکن اس رات میری تقدیر میں نیند لکھی ہی نہ تھی۔ کیونکہ ابھی مجھے سوئے ہوئے مشکل سے دو گھنٹے گزرے ہوں گے کہ خود بخود میری آنکھ کھل گئی اور میں ایک انجانی الجھن سے گھبرا کر کمرے کی کھڑکی کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ اور پھر میری آنکھیں جیسے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

آج کانٹج کے پچھلے حصے میں ایک دو نہیں تقریباً ایک درجن بلیاں موجود تھیں۔ مختلف رنگوں اور مختلف جسموں والی بلیاں۔ کالی، بھوری، سفید، سرخ، ایک ہی جگہ ایک ساتھ اتنی زیادہ بلیاں دیکھ کر سردی کے باوجود میرے ماتھے پر پسینے کی ہلکی سی بوندیں آگئیں۔ دھڑکتے دل اور منجمد ہوتے ہوئے خون کے ساتھ میں ان بلیوں کا وحشیانہ رقص دیکھتا رہا۔

کالی ملی ان کے وسط میں موجود تھی۔ چمکتی آنکھوں والی اس خوفناک ملی پر نظر پڑتے ہی میں اس کو پہچان گیا۔ یہ وہی ملی تھی جو ریلوے کمپارٹمنٹ میں مجھے دکھائی دی تھی۔ یہ وہی ملی تھی جو کل رات کانٹج کے صحن میں موجود تھی۔

پھر اچانک کالی ملی کو شاید وہاں میری موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ ان سے الگ ہو کر دھیمی رفتار سے چلتی ہوئی میرے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔

ایک لمحے کے لیے میں گھبرا سا گیا۔ اس کے چند ہی لمحوں بعد وہاں موجود تمام بے اور بلیاں مجھے گھیرے میں لیے ہوئے تھیں۔ ان کی خونخوار نظریں کسی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ تھیں۔ میں ان خونی نظروں کی تاب نہ لا سکا اور کانپ کر رہ گیا۔ لیکن اپنے کمرے سے جب اس ارادے سے باہر نکلا تھا تو پستول ضرور ساتھ لایا تھا۔

پھر اچانک کالی ملی کی آنکھوں میں ڈراؤنی چمک تیز ہو گئی۔ میں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔

میرا ہاتھ پستول کی طرف چلا گیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ اور سوچتا وہ مجھ پر حملہ آور ہوئی۔ میں ان سے جان چھڑا کر بڑی تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بھاگا۔ جب اپنے کمرے میں پہنچا تو وہی کالی بلی میرے ساتھ ہی داخل ہوئی اس کے بعد وقت ضائع کئے بغیر میں نے اس پر گولی چلا دی۔



حمید نے اپنے بیان میں ظفر پر الزام لگایا کہ وہی ناہید کا قاتل ہے ورنہ ظفر کے پستول سے نکلی ہوئی گولیاں ناہید کے جسم سے کیوں برآمد ہوئیں۔ عدالت کا فیصلہ باقی تھا کہ ایک رات جیل میں سب نے بلی کی بھیانک آوازیں سنیں۔ ظفر محسوس کر رہا تھا کہ یہ آوازیں اس کے قریب آتی جا رہی ہیں۔

جلدی ہی بلی کی بھیانک چیخیں ظفر کے بالکل قریب سے آنے لگیں۔ ایسی چیخیں جن میں بیک وقت غم بھی تھا اور غصہ بھی، ایسی چیخیں جن پر موت کے دل فگار نغمہ کا شبہ ہوتا تھا، ایسی چیخیں جن کو سن کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی خبیث روح دیوانی ہو کر کوئی موت آفریں راگ الاپ رہی ہے۔

ظفر کانپ کر رہ گیا۔

جیل کے پھانسی گھر کی ایک بند کو ٹھہری میں کانپ کر، ڈر کر لرز کر کھڑے ہو جانے کے علاوہ ظفر اور کر بھی کیا سکتا تھا؟ اس نے چاہا کہ خود بھی چیخ پڑے، لیکن وہ چیخ نہ سکا۔ اس نے چاہا کہ وہ جیل وار ڈر کو مدد کے لیے پکارے، لیکن وہ پکار نہ سکا۔ اس نے کوشش کی کہ وہ چلا چلا کر اس بلی کی خونی داستان چیخ چیخ کر پوری جیل کو سنا دے، لیکن وہ اپنی یہ آرزو بھی پوری نہ کر سکا۔

آواز اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئی تھی، گھٹ کر رہ گئی تھی، ختم ہو کر رہ گئی تھی اور پھر بالکل اچانک ظفر نے اندھیرے کے باوجود یہ دیکھ لیا کہ سیاہ بلی اس راہ داری میں داخل ہو چکی ہے جس کے خاتمہ پر کوٹھریوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔



اس کا مطلب یہ تھا کہ اب ملی اور اس کے درمیان صرف چند گز کا فاصلہ رہ گیا

تھا۔

ایک مرتبہ پھر ملی کی چیخ فضا میں گونجی اور ماحول کو ہیبت ناک بناتی ہوئی ہوا میں گم ہو گئی۔ ایک مرتبہ پھر ظفر کا کلیجہ کانپ گیا۔

ملی کی یہ بھیانک چیخیں صرف ظفر ہی نہیں، جیل کے تمام قیدی سن رہے تھے، جیل کے تمام چوکی دار سن رہے تھے، بارکوں کے تمام وارڈر سن رہے تھے اور چونکہ انہوں نے آج تک کسی ملی کی اتنی وحشت ناک چیخیں نہیں سنی تھیں، اسی لیے سب ہی حیران تھے کہ بھیانک اور لرزہ خیز چیخوں والی یہ نئی ملی آج کہاں سے آگئی۔

سب سے زیادہ حیرت پھانسی گھر کے وارڈر کو تھی۔ کیوں کہ اس پھانسی گھر کے اس حلقے میں جہاں قتل کے ملزموں کو عدالت کے فیصلے تک رکھا جاتا تھا، آج تک کسی ملی کو نہیں دیکھا تھا، کسی ملی کی چیخیں نہیں سنی تھیں، کسی ملی کا سایہ تک نہیں دیکھا تھا۔ لیکن آج جب یہ آوازیں بار بار اس کے کانوں سے ٹکرائیں، اور پھر جب اس نے بھی۔ یہ محسوس کیا کہ یہ چیخیں اس کے بالکل قریب سے آرہی ہیں تو سخت دل ہونے کے باوجود خود اس کا دل بھی لرز گیا، اور وہ بھی گھبرا کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

اس وقت رات کے ٹھیک دو بج رہے تھے، جیل میں پہرے کی روشنی کے علاوہ ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ آسمان پر سیاہ بادلوں کی یورش کی وجہ سے چاند ستارے بھی دنیا کو اپنی روشنی سے محروم کر چکے تھے۔ ماحول بالکل سنسان تھا اور فضا بالکل تاریک۔ ایسی رات میں اگر ایک ملی کی چیخیں مسلسل سنائی دیں اور وہ ملی دور دور تک کہیں دکھائی بھی نہ دے، تو دنیا کا ایسا کون سا انسان ہے جو خوف سے لرز نہ جائے گا۔ پھانسی گھر کے وارڈر کے دل کی یہی حالت ہو چکی تھی، کیوں کہ اس نے لالٹین اٹھا کر دور دور تک اس کی روشنی پھیلا دی تھی اور اسے کہیں بھی چیخنے والی ملی نہیں دکھائی دی تھی، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ کوٹھری میں بند ظفر اس ملی کو راہ داری میں داخل ہوتے دیکھ چکا تھا۔

ایک مرتبہ وارڈر نے لالٹین اٹھا کر اس کی روشنی میں ملی کو دیکھنا چاہا۔ لیکن جب اس مرتبہ بھی اسے ملی نہیں ملی تو اس نے ٹارچ جلا کر ملی کو تلاش کرنا چاہا۔ وہ بار بار ٹارچ کی روشنی ادھر ادھر ڈالتا، اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سوچتا جاتا کہ کہیں یہ ملی کوئی خبیث روح نہ ہو، کیوں کہ وہ بھی مچھن سے یہی سنتا چلا آرہا تھا کہ کبھی کبھی آوارہ اور گناہ گار روحمیں ملی کا روپ اختیار کر کے آبادیوں میں داخل ہو جاتی ہیں۔

ان کو ٹھڑیوں کے بعد ہی پھانسی گھر تھا، جہاں مجرموں کو پھانسی دی جاتی تھی۔ وارڈر اب تک بے شمار مجرموں کو پھانسی پاتے، دم توڑتے اور موت کی آخری ہچک لیٹے دیکھ چکا تھا۔ اس نے ان کے بھیانک چہرے بھی دیکھے تھے، اہلی ہوئی آنکھیں بھی دیکھی تھیں اور حلق سے باہر لٹکتی ہوئی زبان بھی۔ اس کے ذہن کے پردوں میں لا تعداد پھانسی پائی ہوئی لاشوں کے بھیانک چہرے محفوظ تھے۔ یہ تمام چہرے ان لوگوں کے تھے جنہوں نے انسان ہوتے ہوئے انسان کو قتل کیا تھا اور اپنی انتہائی بے رحمی اور شقاوت قلبی کا مظاہرہ کیا تھا۔ آج جب وارڈر نے اس نہ دکھائی دینے والی ہلی کی لرزہ خیز چیخیں سنیں تو جیسے اس کو ماضی کی تمام لاشیں یاد آگئیں اور پھر جیسے اس کو یقین سا ہو گیا کہ یہ چیخیں یقیناً کسی خبیث روح کی ہی ہو سکتی ہیں جس نے ہلی کی شکل اختیار کر لی ہے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ چیخنے والی یہ ہلی تھی کہاں؟

اور پھر وارڈر بھی اچانک گھبرا کر چیخ پڑا۔ نہ دکھائی دینے والی ہلی کی غیظ و غضب میں ڈوبی ہوئی چیخیں اب اس کی برداشت سے باہر ہو چکی تھیں۔

وارڈر چونکا، کیوں کہ اس نے آج تک پھانسی گھر کے سخت دل اور ظلم پسند وارڈر کی خوف زدہ آواز نہیں سنی تھی۔ دوسری چیخ پر وہ بھی پھانسی گھر کی طرف دوڑ پڑا۔ یہ اور بات ہے کہ ہلی کی مسلسل چیخیں سن کر خود اس کا دل بھی بڑی دیر سے دھک دھک کر رہا تھا۔

ظفر نے وارڈر کی یہ چیخ سنی۔ لیکن جب اس نے یہ چیخ سنی تو ہلی اس کی کوٹھری کے بالکل نزدیک آچکی تھی۔ اتنی نزدیک کہ اب وہ ہلی کی روشن آگ جیسی آنکھوں کو بھی دیکھ رہا تھا اور سرخ ہونٹوں کو بھی اندھیرے میں ہلی کے سفید نوکیلے دانت ایک ایسی ڈائن کے دانتوں کی طرح چمک رہے تھے، جس نے محض چند منٹ پہلے کسی کا خون پیا ہو اور اس طرح اس کے دانتوں پر خون کی ہلکی سی سرخی بھی باقی رہ گئی ہو۔

سیاہ ہلی اب خاموش ہو چکی تھی اور بالکل آہستہ آہستہ بے آواز قدموں کے ساتھ ظفر کی کوٹھری کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اور بے یار و مددگار ظفر بالکل ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے ہلی نہیں خود اس کی موت اس کی طرف اپنے ظالمانہ قدم بڑھا رہی ہو۔ ایک مرتبہ پھر اس نے اپنی پوری قوت سے چیخا چاہا لیکن اس کی تمام جسمانی طاقت جیسے سلب ہو کر رہ گئی تھی۔

وہ اس مرتبہ بھی نہیں چیخ سکا، اور ہلی بڑھتے بڑھتے اس کی کوٹھری کے بالکل سامنے پہنچ گئی۔ بالکل وہی ہلی۔ ویسی ہی سیاہ، ویسی ہی بھیانک، ویسی ہی ڈراؤنی، وہی

انگارہ ایسی آنکھیں، وہی نوکیلے اور چمک دار دانت۔

ظفر پہچان گیا کہ یہی وہ بلی ہے جس پر اس نے گولی چلائی تھی اور جس نے زخمی ہو کر خود اس کی نظروں کے سامنے دم توڑا تھا۔ وہی بلی جو حمید کے ہنگے میں اس کے لیے ایک سوالیہ نشان بن گئی تھی۔ وہی بلی جو دبے پاؤں کسی خوفناک ارادے سے اس کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ وہی بلی جو نینی تال آتے وقت ریل کے کپار ٹمنٹ میں ناہید کی برتھ پر سوتی دکھائی دی تھی اور پھر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک خوبصورت عورت میں تبدیل ہو گئی تھی۔

سیاہ بلی چند لمحوں تک اس کی کوٹھڑی کے سلاخوں دار دروازے کے سامنے کھڑی ظفر کی طرف خونی نظروں سے دیکھتی رہی، نہ جھپکنے والی آنکھوں سے اس پر آگ برساتی رہی اور پھر اپنا منہ کھول کر، دانت باہر نکال کر اس طرح چیخی کہ ظفر کی پیشانی پر موت کا پسینہ چھلک پڑا۔

بالکل غیر ارادی طور پر وہ دروازے کے بالکل نزدیک آگیا اور اس نے دروازے کی سلاخیں انتہائی مضبوطی کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیں۔ بلی اور اس کے درمیان اب صرف دو فٹ کا فاصلہ باقی تھا۔

قاتل اور مقتول دونوں آمنے سامنے آچکے تھے۔

سیاہ بلی ایک لمحہ کے لیے سمٹی، بالکل ایسے انداز میں جیسے وہ جست لگانے کے لیے پوری طرح تیار ہو چکی ہو، اور پھر اس طرح غرائی جیسے وہ نینی تال میں ظفر کے کمرے میں اس پر حملہ کرنے سے قبل غرائی تھی۔

اور پھر۔۔۔ ٹھیک اسی لمحے ظفر کے حلق میں پھنسی ہوئی آواز ایک فلک شگاف اور دردناک خوف زدہ چیخ بن کر پھانسی گھر کی راہ داری میں گونج گئی۔ یہی وہ چیخ تھی جس نے پھانسی گھر کے خوف زدہ وارڈر اور اس کے ساتھی کو پلک جھپکتے میں اس کی کوٹھڑی کے سامنے پہنچا دیا۔

”کیا ہوا ظفر؟“ وارڈر نے ٹارچ کی روشنی ظفر کے چہرے پر ڈالتے ہوئے کہا۔  
”وہ پھر آگئی۔۔۔ وہ مر کر زندہ ہو گئی ہے۔۔۔“ ظفر ہدیائی انداز میں دیوانوں کی طرح چلایا۔

”کون آگئی ہے؟ کون مر کر زندہ ہو گیا ہے؟“ سہمے ہوئے وارڈر نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

”وہی۔۔۔ وہی سیاہ بلی جس کے قتل کے الزام میں مجھ پر مقدر چل رہا ہے۔“

لیکن اب کو ٹھری کے سامنے ہلی کا کوئی پتہ نہ تھا۔  
 ”ابھی۔۔۔ بالکل ابھی تمہارے آنے سے محض دو لمحے پہلے وہ یہاں میری کو ٹھری  
 کے بالکل سامنے موجود تھی۔ میں سچ کہتا ہوں وہ ابھی یہاں تھی۔“  
 ”لیکن ہم نے تو کسی سیاہ ہلی کو یہاں نہیں دیکھا۔ البتہ ہم نے ایک ہلی کی چیخیں  
 ضرور سنی تھیں۔“ دوسری بارک کے وارڈر نے جواب دیا۔  
 ”ہاں۔۔۔ یہ چیخیں اسی ہلی کی تھیں۔ وارڈر میں اسے اچھی طرح پہچانتا ہوں،  
 مجھے اس کی موت سے پہلے بھی اس کی خوں خوار اور انگارہ ایسی آنکھیں یاد تھیں اور آج  
 بھی یاد ہیں۔ وہ ابھی یہاں تھی بالکل ابھی۔“

دیر تک ظفر اسی طرح ہذیبانی انداز میں ہلی کی موجودگی کی کہانی بیان کرتا رہا۔  
 دہشت زدہ وارڈر اس کہانی کو سنتے رہے۔ دونوں کے لیے اس کہانی پر یقین کرنے کے  
 سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کیوں کہ ہلی کو تلاش کرنے کے لیے خود ان کی ہمتیں بھی جواب  
 دے چکی تھیں۔

وہ اتنے دہشت زدہ ہو چکے تھے کہ کوشش کے باوجود ان سے اپنی جگہ سے ہلا تک  
 نہیں گیا۔ واقعی ان کے قدم سو سو من کے ہو چکے تھے۔ ان کے لیے سب سے بڑا  
 سوال یہ تھا کہ جب انہوں نے بھی ہلی کی چیخیں سنی تھیں اور جب ظفر باہوش و حواس یہ  
 بیان دے رہا ہے کہ اس نے ایک سیاہ ہلی کو بلکہ اسی ہلی کو جسے وہ اپنے پستول سے پچیس  
 دن پہلے ہلاک کر چکا ہے، اپنی کو ٹھری کے سامنے کھڑے دیکھا ہے، تو یہ ہلی ہوئی کیا؟  
 یہ ہلی ان دونوں کو کیوں نہیں دکھائی دی اور صرف ظفر کو ہی کیوں نظر آئی؟ اس  
 کا سبب یہ تو نہیں ہے کہ اب وہ ایک ہلی نہیں تھی، ہلی کا بھوت تھی، ایک خبیث روح  
 تھی؟ لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ نینی تال کی یہ مقتول ہلی اب ایک بھوت بن چکی تھی  
 تو اس کی آواز پوری جیل کو کیوں سنائی دی، اور جب آواز سنائی دی تو وہ دکھائی کیوں نہیں  
 دی؟

چونکہ ان سوالوں میں سے کسی سوال کا جواب نہ ظفر کے پاس تھا اور نہ ان دونوں  
 وارڈروں کے پاس، اس لیے تینوں تمام رات بھوں کی طرح خاموش اپنی اپنی جگہ بیٹھے  
 رہے۔ ان کے خوف کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے اس کے بعد ایک دوسرے سے بات تک  
 نہیں کی۔ اسی طرح صبح ہو گئی۔

صبح کو جیسے ہی جیل کے قیدیوں کی بارکیں کھولی گئیں اور جیل کی زندگی میں چہل پہل کا آغاز ہوا، یہ خبر بھی پھیلتی چلی گئی کہ رات کو ایک خبیث روح نے ہلی کے روپ میں جیل پر حملہ کیا تھا۔ اور اس طرح ظفر کی کہانی تمام قیدیوں کی ہی نہیں جیل کے پورے عملے کی زبانوں پر بھی پھیل گئی۔

کہانی جیلر کے کانوں تک بھی پہنچی، اور سپرنٹنڈنٹ تک بھی۔ دونوں نے ظفر اور دونوں وارڈروں کو بلا کر اس کی تصدیق بھی چاہی۔ ظفر نے ان اعلیٰ افسروں کے سامنے بھی رات کی پوری کہانی بیان کر دی۔ اس نے کہا ”میں ایم اے پاس ہوں جیلر صاحب“ اور ایک اعلیٰ ترقی یافتہ خاندان کا فرد بھی ہوں۔ میں کبھی وہمی نہیں رہا ہوں۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ جس سیاہ ہلی کے قتل کے عجیب و غریب جرم میں مجھ پر مقدمہ چل رہا ہے اور جس کی لاش میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی وہ کل رات میری کوٹھری کے سامنے موجود تھی۔“

جیل کے وارڈر نے کہا ”رات کے دو بجے ہم نے ہلی کی چیخیں سنیں، ہم حیران تھے کہ جب جیل میں کوئی ہلی نہیں ہے تو یہ چیخ کہاں سے آرہی ہے۔ ہم نے روشنی کی مدد سے پھانسی گھر کے سرکل میں اس مسلسل چیخنے والی ہلی کو تلاش کیا لیکن ہم کو یہ ہلی کہیں نہیں دکھائی دی، جب کہ ظفر یہ کہتا ہے کہ ہلی پہلے راہ داری میں داخل ہوئی اور اس کے بعد اس کی کوٹھری کے سامنے آکر ٹھہر گئی۔“

ظفر مسلسل ہلی کی موجودگی پر زور دیتا رہا۔ ہلی کی کہانی کو سچ ثابت کرنے کے لیے اس نے اپنا سارا زور بیان صرف کر دیا۔ وہ بار بار یہ کہتا رہا ”سیاہ ہلی مر کر دوبارہ زندہ ہو گئی

ہے اور اب مجھ سے اپنی موت کا بدلہ لینا چاہتی ہے۔“  
 اس نے یہ جملہ اتنی مرتبہ کہا اور کچھ اس انداز میں کہا کہ جیلر کو اس کے صحیح  
 الذہن ہونے پر شک ہو گیا۔ جیلر نے سوچا۔ ”کیس ظفر پاگل تو نہیں ہو گیا ہے۔“  
 اس خیال کا آنا تھا کہ اس نے سپرنٹنڈنٹ سے مشورہ کرنے کے بعد ڈسٹرکٹ  
 سول سرجن کو طلب کر کے اس پر بھی اپنا اندیشہ ظاہر کر دیا۔  
 ”مجھے یقین ہے کہ ملزم ظفر پاگل ہو چکا ہے۔“  
 جیلر نے کہا۔



”آپ نے جو کہانی بیان کی ہے اور ملزم کی ذہنی کیفیت کا جو حال بیان کیا ہے، اس  
 سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ ملزم کا ذہن کسی غیر معمولی حد تک یا کسی غیر معمولی غم کا  
 متحمل نہیں ہو سکا ہے اور اس کے عمل میں کمی آگئی ہے۔“  
 ”میرا خیال ہے آپ اس کا طبی معائنہ کر لیں۔“ جیلر نے دوبارہ مشورہ دیا۔  
 ”ہاں۔۔۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں۔“

لیکن جب جیل کے ہسپتال میں ضلع کے سب سے بڑے سرکاری ڈاکٹر نے ظفر  
 کا معائنہ کیا تو نہ تو وہ جسمانی طور پر بیمار نکلا اور نہ ذہنی طور پر معطل۔ سول سرجن کی  
 آخری رائے یہ تھی کہ ملزم ذہنی اور جسمانی اعتبار سے بالکل تندرست ہے اور اس میں  
 کوئی خامی نہیں ہے۔

ظفر کو ہسپتال سے دوبارہ پھانسی گھر کی کوٹھری میں پہنچا دیا گیا۔ سول سرجن کو  
 پورا یقین تھا کہ ظفر ذہنی اعتبار سے بالکل تندرست ہے اور اس میں کوئی خرابی نہیں  
 ہے، لیکن اس کے چہرے پر پھیلے ہوئے خوف اور آنکھوں میں سمائی ہوئی مستقل دہشت  
 نے اس کو مجبور کر دیا کہ وہ ظفر کی پرسکون نیند کا بندوبست کر دے۔ اس نے جیلر کو  
 ایک خواب آور دوا دے کر یہ ہدایت کر دی کہ ظفر کے علم میں لائے بغیر اس کو یہ دوا  
 پانی میں ملا کر رات کے کھانے کے بعد پلا دی جائے۔ اس طرح ملزم تمام رات گہری  
 نیند سو رہا ہے گا۔

اسی طرح دن تمام ہو گیا۔

رات آئی تو اپنے ساتھ ایک نئی دہشت لے کر آئی کیوں کہ پھانسی گھر کے وارڈر  
 ہی کو نہیں جیل کے تمام قیدیوں تک کو یقین تھا کہ ملی کی کہانی بالکل سچی ہے۔  
 جیل کے قیدیوں میں بھی ملی کی بھیانک چیخوں کی کہانی پھیل چکی تھی اور جس کے  
 باہر عملے کے کوارٹروں میں بھی اس کا افسانہ دہشت اور ہیبت پیدا کر چکا تھا۔

دوسری رات بھی نہ دکھائی دینے والی ہلی کی درد بھری چنجیں سنائی دیں۔ یہ چنجیں صرف اسپتال کے پلنگ پر لیٹے ہوئے ظفر کے کانوں تک ہی نہیں پہنچی تھیں، ہر اس آدمی کے کانوں سے ٹکرائی تھیں جو جیل کی اس مختصر لیکن انوکھی دنیا میں جاگ رہا تھا۔ چنانچہ بعض جیلے وارڈروں نے جوہد وقوں سے مسلح ہو کر رات کو پہرہ دیا کرتے تھے، یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ اس ہلی کو ہلاک کر کے ہی دم لیں گے۔

انہوں نے سیاہ ہلی کی تلاش شروع کر دی۔۔۔ تمام رات سیاہ ہلی کی تلاش کا سلسلہ جاری رہا، ہمد وقوں میں کار توں بھرے رہے، لیکن یہ کار توں استعمال نہ ہو سکے، کیوں کہ تمام رات ہلی کا اصل وجود نگاہوں سے اوجھل رہا، صرف اس کی چنجیں فضا میں لرزہ خیز دہشت پھیلاتی رہیں۔

ایک مسلح وارڈر ظفر کے پلنگ کے پاس ہمدوق ہاتھ میں لیے تمام رات مستعدی سے پہرہ دیتا رہا، اسپتال کی بتیاں تمام رات جلتی رہیں اور خوف زدہ مریض تمام رات جاگتے رہے، لیکن سیاہ ہلی ظفر کے پلنگ سے دور رہی، یا تو شاید اس لیے کہ وہ دوبارہ ہمدوق کی گولی کا نشانہ بننا نہیں چاہتی تھی اور یا وہ خود روشنی سے خوف زدہ ہو چکی تھی۔

لیکن ظفر کو پورا یقین تھا کہ سیاہ ہلی اپنی تمام خباثتوں کے ساتھ اس کے بالکل قریب موجود ہے اور موقع ملتے ہی اس پر حملہ کر دے گی۔ تمام رات وہ بھی جاگتا رہا، دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ، ڈوبتی ہوئی نبضوں کے ساتھ پتھرائی ہوئی غم زدہ آنکھوں کے ساتھ، اور بھولی ہوئی یادوں کے اس بے پناہ ہجوم کے ساتھ جس نے اس کے اعصاب کو مفلوج سا کر دیا تھا، ڈاکٹر کی خواب آور دوا اس کو گہری نیند سلانے میں سہجہ ناکام ثابت ہو چکی تھی۔ یقیناً یہ صورت حال اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔

اس کے والد بمبئی میں تھے، اور محض بدنامی کے خوف سے اس نے اب تک اپنے والد کو اپنی انجانی مصیبتوں کی داستان نہیں لکھی تھی۔ وہ خوب جانتا تھا کہ اس کے آزاد خیال باپ کو سیاہ ہلی کی داستان پر ہر گز یقین نہیں آئے گا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے فیصلہ کر لیا کہ صبح ہوتے ہی وہ سب سے پہلے اپنے باپ کو تفصیلی تار روانہ کر کے ان کو نینی تال طلب کرے گا۔

اب عدالتی فیصلے میں بھی صرف چار دن باقی رہ گئے تھے۔

ظفر کا تمام سامان اور روپیہ پیسہ جیل میں جمع تھا، اس لیے اس نے صبح ہوتے ہی سب سے پہلے جیلر سے یہ درخواست کی کہ یا تو اسے اپنے والد کو ٹرنک کال کرنے کی سہولت دی جائے اور یا اس کا لکھا ہوا تار اس کے خرچ پر بمبئی روانہ کر دیا جائے۔ ظفر

چوں کہ اب تک صرف ملزم تھا مجرم نہیں تھا، اس لیے اس کو تار بھینچنے کی اجازت دے دی گئی۔ یوں بھی جیل کے قانون کے مطابق حوالاتی ملزموں کو اپنے دفاع کے سلسلے میں حکام کی طرف سے ہر قسم کی سہولتوں کی فراہمی ملزموں کا حق سمجھا جاتا ہے۔

جیلر بھی تمام رات بلی کی چیخیں سنتا رہا تھا، اس لیے فطرتاً سے ظفر سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ جیلر کو یقین ہو گیا تھا کہ ظفر بالکل بے گناہ ہے اور خبیث بلی واقعی اس کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ اس نے ظفر سے پوچھا ”رات کو نیند آئی تھی۔۔۔“ جیلر واقف تھا کہ ڈاکٹر کے مشورے سے ظفر کو خواب آور دوا پلا دی گئی تھی۔

”جی نہیں، نیند تو ایک لمحے کے لیے بھی نہیں آئی۔ آپ خود سوچئے بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ تمام رات بلی میرے پلنگ کے قریب موجود رہے اور میں سوتا رہوں۔“ ظفر کے اس جواب نے جیلر کو حیران کر دیا، وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ خواب آور دوا کی اتنی زیادہ خوراک بھی ناکام رہ سکتی ہے۔ اس نے آج کی رات کے لیے ایک بالکل نیا منصوبہ بنایا۔

جیلر جیل کے باہر ہی ایک چھوٹے سے بگھے میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا، اور چوں کہ گزشتہ دو دن سے خود اس کے بچے بھی تمام رات خوف زدہ رہے تھے، اس لیے وہ ہر قیمت پر جیل کو اس خبیث سیاہ بلی سے نجات دلادینا چاہتا تھا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ سیاہ بلی تو ہمیشہ نظروں سے اوجھل رہتی تھی۔

تمام دن جیل کی دنیا میں ایک عجیب قسم کی دہشت پھیلی رہی، کوارٹروں میں رہنے والے بعض مسلمان وارڈر شہر جا کر ملاؤں سے تعویذ لے آئے اور انہوں نے ان تعویذوں کو دروازے کی چوکھٹ میں دفن کر دیا۔ تاکہ تعویذ کی برکتوں سے کم از کم ان کے کوارٹربلی کی نحوست سے محفوظ رہیں۔ ہندو وارڈروں نے برہمن پنڈت بلوا کر منتر جاپ کرانے کے بعد اپنے کوارٹروں کے چاروں طرف جادو کا حصار کھینچوا لیا، تاکہ اگر بلی اس حصار میں داخل ہو تو فوراً بھسم ہو جائے۔

ایک وارڈر کالاکھان کی غریب آبادی میں رہنے والے ایک عامل کو بلا لایا۔ کیوں کہ سیاہ بلی کی کہانی سننے کے بعد اس عامل نے دعویٰ کیا تھا وہ اپنے عمل کے زور سے اس بلی کو اس کے اصلی روپ میں دست بستہ اپنے قدموں پر جھکا دے گا۔ عامل کی عمر اسی برس سے زیادہ ہو چکی تھی اس کے بارے میں نینی تال ہی میں نہیں، دور دور تک یہ مشہور تھا کہ وہ جنوں اور بھوت پریتوں کو فوراً اپنے عمل کی طاقت سے زیر کر لیتا ہے۔۔۔ ہر جمعرات کو اس کی جھونپڑی میں لوگوں کا ہجوم جمع ہو جاتا۔ اس ہجوم میں وہ



لوگ بھی ہوتے جن کو کوئی بھوت پریشان کرتا تھا اور وہ لوگ بھی ہوتے جن کی بیوی یا لڑکی پر کسی جن کا سایہ ہوتا۔ عامل کسی کو تعویذ دے دیتا، کسی کی آنکھ میں کا جل لگا دیتا۔ زیادہ طاقت ور جن یا بھوت پریت کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ معمول کے مطابق مکان پر باقاعدہ عمل پڑھنے کے لیے جایا کرتا تھا۔ اور چوں کہ وہ یہ کام محض خدمت خلق کے لیے کرتا تھا اور اس کا کوئی معاوضہ نہیں لیتا تھا، اس لیے اس کی شہرت بھی ہو گئی تھی اور توہم پرستوں میں اس کو عزت کا درجہ بھی حاصل ہو گیا تھا۔ بوڑھا عامل فراست کے اوقات میں یا تو عبادت کرتا رہتا، یا کوئی عمل پڑھتا رہتا۔ مشہور تھا کہ اس نے اپنے ہم زاد کو اپنا غلام بنالیا ہے، اور وہی نا دیدر طور پر اس کی خدمت کرتا رہتا ہے۔

شام سے پہلے ہی عامل جیل کے باہر اس بستی میں پہنچ گیا جہاں کافی دور سے وارڈروں اور دوسرے سرکاری ملازموں کے کوارٹر پھیلے ہوئے تھے۔ ان کوارٹروں کے وسط میں جیلر اور جیل سپرنٹنڈنٹ کے بنگلے تھے۔ جیلر کو بھی عامل کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی، لیکن اس نے کوئی روک ٹوک نہیں کی اور وہ روک ٹوک کرتا بھی کیسے، جب کہ یہ انسان کی فطرت ہے کہ حالات کے مقابلے میں بالکل بے بس ہو جانے پر وہ فوراً روحانی طاقت کے سامنے سر جھکا دیتا ہے، اور یہی وہ موقع ہوتا ہے جب بڑے سے بڑے مادہ پرست روح کے قائل ہو جاتے ہیں، روح کے بھی اور ان دیکھی طاقت کی عظمت کے بھی۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ جیلر نے سیاہی کے مقابلے پر اپنا آج کی رات کا منصوبہ منسوخ کر دیا تھا۔ اس نے بھی اپنے منصوبے پر عمل کرنے کی تمام تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ ویسے جیلر تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے روح سے زیادہ مادہ کا قائل تھا۔ ادھر جیل کے باہر پمپل کے ایک پرانے درخت کے نیچے عامل اپنے چاروں طرف ایک حصار کھینچ کر بیٹھ چکا تھا۔ یہ حصار اس نے انسانی ہاتھ کی ہڈی سے کھینچا تھا۔ عامل کا دعویٰ تھا کہ اس ہڈی سے بنائے ہوئے حصار کے اندر کوئی بھی خبیث روح داخل نہیں ہو سکتی، اور اگر داخل ہونے کی کوشش کرے گی تو لکیر پر قدم رکھتے ہی وہ آگ میں بھسم ہو جائے گی۔

اپنے سامنے اُلی کے کونلے دہکا کر اس نے ان پر پڑھا ہوا لوبان ڈالا دھواں پھیلنے ہی اس نے اپنا عمل پڑھنا شروع کر دیا۔ عمل کے دوران میں وقتاً فوقتاً جلتے ہوئے کونلوں پر لوبان ڈالتا جاتا۔ جیسے جیسے رات بڑھتی گئی آس پاس کی فضا لوبان کے دھوئیں سے بو جھل ہوتی گئی۔ عامل کی آواز ماحول کی خاموشی میں بلند ہونی لگی اور پھر جیسے ہی ملی

کی پہلی چیخ فضا میں گونجی تو ایک طرف جہاں عامل کی آواز میں زیادہ زور پیدا ہو گیا، وہاں کوارٹروں میں دم سادھے بیٹھی ہوئی عورتوں کے حلق سے بھی چیخ نکل گئی۔ انہوں نے خوف زدہ ہو کر اپنے بچوں کو اپنی گود میں چھپا لیا۔

دوسری طرف جیل کے اندر جیلر کا تمام انتظام مکمل تھا، جیل کی بلند دیوار پر جگہ جگہ بجلی کے بڑے بڑے بلب جلا دیئے گئے تھے۔ اسپتال کی چھت پر چاروں طرف گارڈ ہندو قیں لیے تعینات کر دیئے گئے تھے۔ ظفر کے پلنگ کے نزدیک ساری رات کے لیے چار مسلح وارڈروں کی ڈیوٹی لگادی گئی تھی۔ اسپتال کے کمپاؤنڈ میں بھی تیز روشنی کا بندوبست کر دیا گیا تھا، مختلف بارکوں کے احاطوں میں پھرے داروں کو تمام رات چوکس اور مستعد رہنے کی ہدایت کر دی گئی تھی۔ تمام ہندو فوجیوں کو یہ حکم دے دیا گیا تھا کہ وہ سیاہ بلی کو دیکھتے ہی گولی مار دیں۔

چنانچہ جیسے ہی بلی کی پہلی چیخ فضا میں گونجی، ہر ہندو ق فائر کرنے کے لیے تیار ہو گئی۔ تمام پھرے دار، چوکی دار اور وارڈر اپنی اپنی جگہ چوکے ہو کر ہوشیار ہو گئے۔ یہ اور بات ہے کہ بلی کی چیخ سنتے ہی دہشت کی وجہ سے ان کے دلوں کی دھڑکن تیز ہو گئی اور ہونٹ خشک ہونے لگے۔

ظفر کو آج بھی خواب آور دوا کی بڑی خوراک پلا دی گئی تھی اور ڈاکٹر نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر رات کے کسی حصہ میں ظفر کی نیند ٹوٹ جائے تو اس کو ایک اور خوراک پلا دی جائے۔

لیکن اس کے باوجود سیاہ بلی کی چیخ میں نہ معلوم کون سا جادو تھا، کون سا طلسم تھا، کون سی دہشت تھی کہ بلی کی پہلی ہی چیخ پر ظفر کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اچھل کر اپنے پلنگ پر بیٹھ گیا اور پھٹی پھٹی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا، اس کی نظریں اپنے پلنگ کے چاروں طرف تعینات مسلح وارڈروں پر بھی پڑیں اور اس کے کانوں میں عامل کی آواز بھی پہنچ گئی، جو بدستور انتہائی پاٹ دار آواز میں اپنا عمل پڑھے جارہا تھا۔

اچانک فضا میں بلی کی دوسری چیخ پھیلی۔ اور پھر اس چیخ کے ساتھ ہی ایک فائر کی آواز گونج گئی۔ کئی وارڈر دوڑ کر اس پھرے دار کے نزدیک پہنچے۔ جس کی ہندو ق نے آگ اگلی تھی۔ پھرے دار نے کہا اس نے ایک بلی پر جو سامنے کی دیوار پر موجود تھی فائر کر دیا۔ دھڑکتے ہوئے دلوں اور متلاشی نگاہوں کے ساتھ بلی کی لاش تلاش کی گئی۔ دیوار کے سائے میں اس بلی کی لاش بھی مل گئی۔

لیکن اس بلی کا رنگ سیاہ نہیں تھا۔ مقتول بلی کا رنگ بھورا تھا اور وہ اس سے پہلے بھی

کئی مرتبہ جیل میں دیکھی جا چکی تھی۔

عامل کا عمل بدستور جاری تھا۔ بوڑھے عامل کو پورا یقین تھا کہ آدھی رات ہوتے ہی پٹی کی خبیث روح اپنے اصل قالب میں حصار کی لکیر تک پہنچنے کے بعد اس کے قدموں پر سر جھکا دے گی۔

وقت گزر رہا تھا۔ اور اب آدھی رات ہونے میں چند ہی لمحے باقی رہ گئے تھے۔ جیل کی فضا میں سکوت سا طاری تھا۔ ہر طرف ایک گہری لیکن پراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہر شخص اپنی جگہ خاموش اور دبکا ہوا سا بیٹھا تھا۔ پٹی کی چیخیں بھی ختم ہو چکی تھیں اور بظاہر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے عامل کا عمل کامیاب ہو تا جا رہا ہے۔ جیل کے اندر ظفر پر دوبارہ نیند کا غلبہ ہو چکا تھا، اور جیل کے باہر عامل اس طرح زوردار آواز میں اپنا عمل پڑھ رہا تھا کہ سنائے کو چیرتی ہوئی اس کی آواز دور دور تک پھیل رہی تھی۔ عامل کو اپنے عمل کی کامیابی کا پورا یقین تھا۔ وہ آنکھیں بند کئے انجام سے بالکل بے پروا اور ماحول کے ڈراؤنے پن سے بالکل بے نیاز ہو کر اپنا عمل پڑھ رہا تھا۔ اسے اپنے علم پر پورا بھروسہ تھا اور اسے کامل یقین تھا کہ بارہ بجتے ہی پٹی کی خبیث روح اپنے اصل روپ میں اس کے حصار پر سر پٹکتی حاضر ہو جائے۔۔۔ اور ہوا بھی یہی۔

”میں آگئی ہوں“ عامل کے کان میں ایک نسوانی سرگوشی پہنچی اور اس نے مسکرا کر آنکھیں کھول دیں۔

حصار کے باہر ایک خوب صورت عورت موجود تھی سفید لباس، سفید رنگ، لیکن چمک دار سیاہ آنکھیں۔

”تمہارا نام؟“ عامل نے بڑے سکون سے پوچھا۔

’ناہید‘ آواز اتنی ہلکی تھی کہ عامل کے علاوہ کسی کے کان میں نہیں پہنچ سکتی تھی۔

”تم پٹی کیوں بن جاتی ہو؟“

”میں پٹی بن نہیں جاتی پٹی تو میں ہوں ہی البتہ ناہید ضرور بن جاتی ہوں؟“

”تو تم ناہید کیوں بن جاتی ہو؟“

”یہ میرا پناہ ہے، اور یہ ضروری نہیں کہ میں اپنا ہر راز آپ کو بتا دوں آپ اپنے عمل کے زور سے مجھے یہاں بلا سکتے ہیں، تو اپنے علم کے بل پر میرا یہ راز بھی معلوم کر سکتے ہیں۔“

جواب میں عامل خاموش رہا اور خاموش کیسے نہ رہتا جب کہ ناہید نے بالکل صحیح بات کہی تھی۔

”آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے؟“ اب ناہید نے سوال کیا۔  
 ”یہ معلوم کرنے کے لئے کہ تم ملی بن کر بے گناہ انسانوں کو اپنی خباثت کا ننگا ناچ  
 کیوں دکھاری ہو؟۔“

”انتقام لینے کے لئے.....“ ناہید نے بدستور سرگوشی کے انداز میں کہا۔  
 ”کس سے؟“ عامل نے پوچھا

”ظفر سے جو جیلی میں بند ہے اور ہر اس وجود سے جو میری راہ میں حائل ہوگا“  
 ناہید کا لہجہ اچانک سخت ہو گیا۔

”لیکن وہ وقت آنے سے پہلے میں تجھے جلا کر راکھ کر دوں گا۔“

”خبیث روح“ عامل نے بدستور بڑی سنجیدگی سے کہا اور اس نے اپنے قریب  
 رکھے ہوئے ایک پیالے سے جو کسی عجیب و غریب انجانی دھات سے بنا ہوا تھا چاول کے  
 چند دانے اٹھا کر ناہید کی طرف پھینک دے

ان چاولوں کا جسم سے چھوٹا تھا کہ ناہید کے حلق سے ایک چیخ سی نکل گئی، ایک  
 ایسی چیخ جو صرف عامل نے سنی تھی۔

”اپنی سفلی طاقتوں کا مظاہرہ ایک معمولی ملی پر نہ کر بوڑھے عامل اگر بہادر ہے اور  
 اگر تجھے اپنے علم و عمل پر پورا یقین ہے تو حصار ختم کر دے“

لیکن عامل پر ناہید کی للکار کا کوئی اثر نہ پڑا پورے سکون و اطمینان کے ساتھ وہ ان  
 چاولوں کو ناہید کی طرف پھینکتا رہا اور اس کے کانوں میں ناہید کی نسوانی چیخوں کی آواز  
 پہنچی رہی۔

لوہیرے دھیرے یہ آواز ملی کی آواز میں بدلی اور پھر یہ آواز ملی کی درد کرب میں  
 ڈوبی ہوئی آواز بن کر حصار کے اندر کی فضا میں گونجنے لگی۔

عامل سمجھا کہ ملی اپنی تمام خباثتوں کے ساتھ فنا ہو رہی ہے اس کا عمل کامیاب ہو  
 رہا ہے اس کا برسوں کا تجربہ کام آ رہا ہے اس کی مہینوں کی ریاضت اپنا جلوہ دکھا رہی ہے  
 اس نے زور زور سے اپنا عمل پڑھنا شروع کیا..... اور پھر جب ملی کی یہ نہ سنائی دینے  
 والی چیخیں بالکل ختم ہو گئیں تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

حصار کے باہر ملی اوندھے منہ پڑی تھی۔

یہ سمجھ کر ملی مر چکی ہوگی اور اس کے ساتھ اس کی ساری خباثتیں بھی ختم ہو چکی  
 ہوں گی عامل نے حصار کے باہر قدم رکھا اور پھر یہ دیکھنے کے لئے کہ مردہ ملی کیسی تھی  
 جیسے ہی وہ جھکا اس کے منہ سے چیخ بھی نہ نکل سکی۔

خوں خوار سیاہ ملی اپنے تیز اور نوکیلے دانت عامل کے زخروں میں گاڑ چکی تھی۔  
یہ سب کچھ ایک لمحہ میں ہو گیا عامل دوسری سانس بھی نہ لے سکا اس وقت رات  
کے ٹھیک دو بج رہے تھے۔



ادھر جیل کے باہر یہ حادثہ ہوا اور چند لمحہ بعد ادھر بالکل اچانک جیل اسپتال کے  
صحن میں انسانی قدموں کی ایک آواز ابھری..... ہلکی آواز..... مدھم آواز  
..... تازک آواز..... ایک ایسی آواز جو نغمہ بن کر فضاء میں گونج رہی تھی۔  
مسلمح وارڈروں نے چونک کر صحن کی طرف دیکھا اور پھر انہیں یہ دیکھ کر اطمینان  
ہو گیا کہ ہلکے ہلکے قدموں کے ساتھ ایک باوردی نرس صحن کو عبور کر کے اسپتال کی  
عمارت میں داخل ہو رہی ہے۔ روشنی میں آنے کے بعد جب وارڈروں نے اس نرس کو  
دیکھا تو وہ اس کی خوب صورتی دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انہوں نے آج تک اتنی خوب  
صورت عورت نہیں دیکھی تھی۔ سفید وردی میں، اپنے جلد کی سفید رنگت، اور سیاہ  
بالوں کے ساتھ وہ بالکل آسمانی حور معلوم ہو رہی تھی، اس کے لب اتنے سرخ تھے کہ  
ان پر کٹے ہوئے تریوز کا شبہ ہوتا تھا۔ آنکھیں اتنی سیاہ تھیں اور پلکیں اتنی لمبی کہ ان کی  
خوبصورتی پر تمام دنیا کا حسن نچھاور کیا جاسکتا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں اسپتال میں  
استعمال ہونے والی چھوٹی سی سفید ٹرے تھی اس ٹرے پر دو اکی ایک شیشی، روئی اور  
ایک سیرنج رکھا ہوا تھا۔

ہلکے ہلکے قدموں کے ساتھ حسن و خوبصورتی کا یہ پیکر کچھ اس انداز سے اسپتال  
کے وارڈ میں داخل ہوا کہ پہرے دار اور وارڈر اس کے ملکوتی حسن سے مرعوب ہو کر  
رہ گئے۔

اسپتال میں کئی نرسیں تھیں..... اکثر یہ نرسیں انتہائی بیمار قیدیوں کی تیمارداری  
کے لیے اسپتال میں رات کو بھی موجود رہتی تھیں۔ اس لیے اس نرس کی آمد بھی غیر

متوقع نہیں سمجھی گئی۔ وارڈر بھی دیکھتے رہے اور مریض بھی اور پھر یہ نرس ظفر کے بلیک کے بالکل قریب پہنچ گئی۔

چند منٹ تک ظفر کو نیند کی حالت میں دیکھتے رہنے کے بعد وہ ظفر کی جانب جھکی۔ ایک ہاتھ سے اس نے ظفر کے بازو پر سے کپڑا ہٹایا، اور دوسرے ہاتھ سے سرنج لے کر وہ ظفر کو انجکشن لگانے کے لیے تیار ہو گئی۔ اب وہ ظفر کے اتنا قریب ہو چکی تھی کہ ظفر کی سانس اس تک اور اس کی سانس ظفر کی ناک تک پہنچ رہی تھی۔ انگوٹھے کی ایک ہلکی سی جنبش سے سرنج کی لمبی اور باریک سوئی اس نے ظفر کے بازو میں پھونک دی۔ اور اچانک ظفر کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے چونک کر نرس کے جھکے ہوئے چہرے اور جسم کی طرف دیکھا اور پھر دوسرے ہی لمحہ اس نے ایسا محسوس کیا جیسے ایک خاص قسم کی بو اس کے بالکل قریب موجود ہے۔ وہی بو جو اس نے ناہید کے جسم سے خارج ہوتی محسوس کی تھی، وہی بو، جو بلیوں کے جسم سے پھوٹتی رہتی ہے۔

اور پھر جیسے ہی اسے محسوس ہوا کہ یہ بو انجکشن لگانے والی نرس کے جسم سے آرہی ہے، اس کے حلق سے ایک دل دوز چیخ نکل گئی، نرس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر اس نے دیوانوں کی طرح دوا کی ٹرے ایک طرف اچھال دی، اور بازو میں چبھا ہوا سرنج نکال کر دور پھینک دیا۔

”ناہید.....“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ وہ ناہید کا نام لے کر اتنی زور سے چیخا تھا کہ اس کی آواز اسپتال کی بارک سے نکل کر دور دور تک پھیل گئی۔ آواز میں اتنا کرب تھا کہ دور کھڑے ہوئے چوکی دار بھی اسپتال کی جانب دوڑنے لگے۔ مریض اپنے بستروں پر چونک کر بیٹھ گئے۔ ہر طرف افرا تفری مچ گئی۔ ظفر مسلسل چیخنے لگا تھا۔

دوسرے ہی لمحے نرس اپنی جگہ سے غائب ہو چکی تھی۔ صبح کو جب ڈاکٹر نے یہ قصہ سنا، تو اس نے کہا ”میں نے کسی نرس کو ڈیوٹی پر نہیں لگایا تھا، کسی نرس کو انجکشن لگانے کی ہدایت نہیں دی تھی بلکہ کل رات تو جیل کے اندرونی احاطہ میں کوئی نرس ہی موجود نہیں تھی۔“

ڈاکٹر نے اتنا کہنے کے بعد خود محسوس کیا جیسے مارے خوف کے اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

انجکشن میں بھری ہوئی دوا کا تجزیہ کرنے پر یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس میں ایک خوف ناک قسم کا زہر بھرا ہوا تھا۔۔۔ اتنا خوف ناک کہ اگر اس کی پانچ بوندیں بھی ظفر

کے جسم میں داخل ہو جاتیں تو اسی لمحہ ظفر کی موت واقع ہو جاتی اور پھر دنیا کی کوئی دوا اس کو نہ چلا پاتی۔

اور اس طرح عامل کی موت کے ساتھ اس نئی دہشت نے جیل کو اپنے مہینوں میں دیوچ لیا۔

اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ اب سیاہ ملی صرف ایک نہ دکھائی دینے والی سیاہ ملی ہی نہیں رہی تھی، اب وہ اپنا قالب بھی بدل رہی تھی، اور اب جیل کے حکام کا یہ اولین فرض ہو گیا تھا کہ وہ ہر قیمت پر ظفر کی حفاظت کریں۔

لیکن سوال یہ تھا کہ کیا ایک روح کے حملے سے کسی انسان کو چلایا جاسکتا ہے؟ اور وہ بھی ایک خبیث روح سے، ایک بھیانک روح سے؟

ڈاکٹر نے ظفر کے ذہن کو سکون پہنچانے کے لیے اس کو مارفیا کا انجکشن دے دیا۔ لیکن اس انجکشن نے بھی ظفر کے اعصاب پر کوئی اثر نہیں کیا، کیونکہ دس بچے دن کو جب حمید اس سے جیل میں ملنے کے لیے آیا اور ظفر کو اس کی آمد کی اطلاع بھیجی گئی تو وہ جاگ رہا تھا۔

ظفر یہ سن کر حیران رہ گیا کہ حمید اس سے ملاقات کے لیے آیا ہے اور اس کی یہ حیرت بالکل حق بجانب بھی تھی، کیوں کہ حمید نے عدالت میں ظفر کے خلاف جو بیان دیا تھا، اس کے بعد اس کا کوئی سوال ہی باقی نہیں رہ گیا تھا کہ حمید اور ظفر کے تعلقات باقی رہ جائیں گے۔

ملاقاتی کمرے میں حمید کا اداس چہرہ دیکھ کر نفرت کے باوجود ظفر کو حمید پر رحم سا آگیا۔ حمید کا چہرہ صرف اداس ہی نہیں تھا، اس کو دیکھ کر تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے اس کے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔

دونوں دوست چند لمحوں تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ اور پھر اچانک حمید دوڑ کر ظفر سے لپٹ گیا، لپٹ ہی نہیں گیا، دھاڑیں مار مار کر رونے بھی لگا۔

وہ بار بار کہہ رہا تھا ”کل رات کو ناہید میرے پاس آئی تھی ظفر۔ وہ مر کر دوبارہ زندہ ہو گئی ہے۔“ پھر اس نے اپنے جذبات پر قابو پانے کے بعد کہا ”میں سچ کہتا ہوں ظفر۔ کل رات کو ٹھیک دو بجے جب میں ہیملن کانٹج کے ہند کمرے میں سو رہا تھا، سوتے سوتے اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں بالکل اندھیرا تھا، لیکن اندھیرے کے باوجود میں نے یہ محسوس کر لیا کہ میرے علاوہ کوئی اور بھی اس کمرے میں موجود ہے، اور جب اپنا اطمینان کرنے کے لیے میں نے لیٹے ہی لیٹے قریب کی میز پر رکھا ہوا ٹیبل لیمپ جلایا تو

جانتے ہو میں نے کیا دیکھا؟ میں نے دیکھا کہ میری مسہری کے دائیں جانب ناہید کھڑی ہے۔ ہاں ہاں، ناہید، میری ناہید، وہی ناہید جس کو تم نے قتل کیا ہے اور جس کی لاش میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ناہید بدستور میری طرف دیکھ رہی تھی، وہ محبت بھری آنکھیں، وہی محبت بھر انداز، وہی محبت بھری مسکراہٹ، وہی لباس اور وہی زیور پہنے جو قتل کے وقت اس کے جسم پر موجود تھا۔ لیکن ظفر، نہ تو اس کی آنکھیں جھپک رہی تھیں اور نہ اس کا سایہ زمین پر پڑ رہا تھا اس نے مجھ سے باتیں بھی کی ہیں ظفر۔ اور تم خوب جانتے ہو کہ اس کی باتیں کتنی پیاری ہوا کرتی تھیں..... اس نے مجھ سے کلا کہ وہ تمہیں قتل کر کے ہی دم لے گی۔

حمید نے اپنے دوست ظفر کو بے قصور ٹھہرایا اور جب عدالت کے سامنے بھی ناہید کے مافوق الفطرت ہونے کے شواہد پیش کئے گئے تو رہائی پانے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔

رہائی پانے کے بعد دونوں دوستوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا اور سب سے پہلے ناہید کی قبر پر گئے۔ دونوں کا اندازہ یہ تھا کہ اس دوران کوئی نئی بات ضرور ہوئی ہو گی۔ جب وہ ناہید کی قبر پر پہنچے تو ان کا یہ اندازہ درست نکلا۔

ناہید کی قبر خالی تھی مٹی کے قدموں کے نشان باہر موجود تھے، لیکن یہ نشان زیادہ واضح نہیں تھے، اور اسی لیے دھڑکتے دل اور کپکپاتے لبوں کے ساتھ ظفر اور حمید ان نشانوں کے سہارے آگے گئے تو انہیں قبرستان کے اندر ہی تقریباً دس گز چلنے کے بعد رک جانا پڑا۔ بظاہر یہ نشان ایک پرانی قبر پر آکر ختم ہو گئے تھے۔ یہ قبر پرانی تھی، لیکن شکستہ نہیں تھی۔ اسی لیے ظفر اور حمید دونوں اس قبر کو غور سے دیکھنے لگے۔

قبر کی بناوٹ، اس کا طرز تعمیر اور اس کا اندازہ یہ بتا رہا تھا کہ قبر کم از کم دو سو سال پرانی ہے، اور اگر ایک ویران قبرستان میں کوئی دو سو سالہ قبر صاف ستھری نظر آئے، اس پر خاک دھول، پرندوں کی بیٹ اور خشک جھاڑیوں کی شاخیں نہ پڑی ہوں اور کسی جگہ سے ٹوٹی پھوٹی بھی نہ ہو تو بھلا کون ہے جسے یہ قبر دیکھ کر حیرت نہ ہوتی۔ لیکن ظفر اور حمید کی حیرت کا سبب صرف یہ نہیں تھا کہ قبر پرانی ہونے کے باوجود بالکل سالم تھی، بلکہ اصل سبب یہ تھا کہ مٹی کے قدموں کے غیر واضح نشان ناہید کی کھدی ہوئی قبر سے شروع ہو کر اسی قبر پر ختم ہوتے تھے۔

قبر کی تعمیر کا انداز مغلوں کے دور حکومت کے انداز تعمیر سے ملتا جلتا تھا۔ مغل دور میں قبروں کا چبوترہ محراب دار بنایا جاتا تھا اور اس پر نقش و نگار بھی بنائے جاتے تھے۔



اس زمانے میں ایک عام رواج قبر کے سرہانے کتبہ نصب کرنے کا بھی تھا۔ اسی کتبہ پر صاحب قبر کی تاریخ وفات اور اس کا نام وغیرہ کندہ کرادیا جاتا تھا۔ یہ قبر بھی محراب دار تھی، اس کے سرہانے بھی ایک سنگی کتبہ نصب تھا۔ ظفر نے جھک کر اس کتبہ کی عبارت پڑھنا چاہی۔ حمید نے پوچھا، کیا دیکھ رہے ہو۔

”میں کتبہ کی عبارت پڑھ کر یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ یہ قبر کس کی ہے اور حقیقتاً کتنے سال پرانی ہے۔“ ظفر نے پرسکون لہجے میں جواب دیا، حالاں کہ ناہید کی قبر کو خالی پا کر اس کے اعصاب پر جو دہشت سوار ہوئی تھی وہ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔



”کیا کتبہ پر کوئی عبارت موجود ہے؟“ حمید نے سوال کیا۔  
 ”ہاں“ ظفر نے جواب دیا۔ ”لیکن یہ عبارت پڑھی نہیں جاسکتی۔“  
 ”کیوں؟“

”اس لیے کہ اس کو کھرچ کر بگاڑ دیا گیا ہے۔ بگاڑنے والے نے کوشش کی ہے کہ کوئی شخص اس عبارت کو پڑھنے نہ پائے۔“  
 ”لیکن کسی نے ایسا کیوں کیا؟“ حمید نے پوچھا۔

”اس کا جواب یہ بھی ہے کہ ملی کے قدموں کے نشان ناہید کی قبر سے شروع ہو کر اسی قبر پر ختم کیوں ہوئے؟“

حمید اس جواب کے بعد خاموش سا ہو گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ناہید کا وجود ایک ملی بن کر اتنا پر اسرار ہو جائے گا۔ واقعات اتنی ہولناک اور دہشت ناک کروٹیں لیں گے اور ناقابل یقین باتیں زندہ اور متحرک بن کر اسرار و ہیبت کی سب سے بڑی حقیقت بن جائیں گے۔ جب سے ظفر نے اس کو اپنی حویلی والی آپ بیتی سنائی تھی تو حمید نے موجودہ حالات کے بارے میں اپنی رائے اور اپنا فیصلہ ہی بدل دیا تھا۔ اور ایک ایسا فیصلہ کیا تھا جو اس نے ابھی تک ظفر کو نہیں بتایا تھا۔

ظفر دیر تک کتبے کی بگڑی ہوئی عبارت کو پڑھنے کی کوشش کرتا رہا لیکن لفظوں، دائروں اور لکیروں کے علاوہ اس کو کتبہ میں کسی بھی لفظ یا حرف کی ساخت نظر نہ آئی۔ مجبوراً اس نے اپنی کوشش ترک کر دی۔ پھر اس نے حمید کو مخاطب کر کے کہا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ پرانی قبر اتنی صاف ستھری کیوں ہے؟“

”لیکن میں اس کے صاف ستھرے ہونے کا سبب جان چکا ہوں۔“ حمید نے بڑے ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا۔

”کیا جان چکے ہو؟“ ظفر نے پوچھا۔

”جان ہی نہیں چکا ہوں، دیکھ بھی چکا ہوں کہ ملی کے قدموں کے نشان اسی قبر پر آکر ختم ہوئے ہیں۔ اور جہاں ملی ہوگی وہاں جو کچھ بھی ہو جائے وہ کم ہے۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ ناہید کی اس قبر سے بھی کچھ وابستگی ہوگی؟“

”ہاں ضرور ہوگی“ حمید نے بڑے سرد لہجے میں جواب دیا، لیکن ناہید کی اس قبر سے کیا وابستگی ہوگی، اس کے بارے میں وہ کوئی رائے قائم نہ کر سکا، اس نے سوچا بہت ممکن ہے یہ ناہید کے مورث اعلیٰ کی قبر ہو۔ لیکن اگر یہ ناہید کے جد امجد کی قبر تھی، تو وہ کون تھا جس نے اس کے کتبہ کی عبارت کو بگاڑ دیا؟ اگر وہ قبر کا دشمن تھا تو اس نے قبر کا نشان مٹانے کی بجائے صرف عبارت کو مٹانے پر ہی اکتفا کیوں کیا؟

دونوں دوست دیر تک قبر کے نزدیک کھڑے رہے۔ اچانک ظفر نے کہا، ”میں قبرستان کے چوکی دار سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس قبر کی صفائی کون کرتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس طرح ہمیں کوئی نئی بات معلوم ہو جائے۔“

”لیکن اس سے فائدہ کیا ہوگا؟“ حمید نے پوچھا۔

”بہت فائدہ ہوگا حمید۔“ ظفر نے جواب دیا، ”اگر ہمیں ناہید کے خبیث ارادوں کا خاتمہ کرنا ہے تو ہمیں اس کے ماضی کی طرف جانا ہوگا ہمیں معلوم کرنا ہوگا کہ ناہید ہے کون؟ تمہاری بیوی بننے سے پہلے وہ کہاں تھی! اس نے تمہیں اپنا شوہر کیوں منتخب کیا؟ وہ ایک انتہائی خوبصورت عورت تھی، لیکن اس نے تمہاری بد صورتی میں وہ کونسی خوبصورتی دیکھی جو وہ دل و جان سے تم پر فدا ہو گئی؟“

حمید نے ظفر کی ان الجھی ہوئی باتوں کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اسی طرح خاموش رہا جیسے اس نے ظفر کے جملے سنے ہی نہیں تھے وہیں کھڑے کھڑے جیسے وہ ماضی کی دھند میں ڈوب کر رہ گیا۔ اسی اثناء میں ظفر قبرستان کے چوکی دار کو آواز دینے کے لیے قبرستان کے دروازے کی طرف بڑھ چکا تھا، جس کے باہر وہ ایک جھوپڑی میں رہا کرتا تھا۔

یہ چوکی دار صرف قبرستان کا چوکی دار ہی نہیں گورکن بھی تھا۔ حمید ماضی کی یادوں میں کچھ اس طرح کھو کر رہ گیا تھا کہ اسے ظفر کے جانے کی خبر بھی نہ ہوئی۔

اس وقت اسے وہ ناہید بری طرح یاد آرہی تھی جو اسے ایک بوڑھے کے ساتھ، جسے وہ اپنا باپ کہتی تھی، رائے پور کی خشک پہاڑی سڑک پر ہر روز ملا کرتی تھی۔ اسی پہاڑی کی ایک بلندی پر حمید کو محکمے کی طرف سے ایک چھوٹا سا نگلہ رہائش کے لیے مل گیا تھا۔ ہر روز سورج ڈوبنے سے پہلے وہ ناہید کو اس سڑک سے گذرتے دیکھا کرتا تھا۔ وہ

سوچا کرتا تھا کہ یہ عورت، یہ خوب صورت عورت جو صنوبر کے درخت سے زیادہ باوقار اور گلاب کے پھول سے زیادہ شاداب اور نرم و نازک ہے ہر روز مقررہ وقت پر کہاں سے آتی ہے اور کہاں چلی جاتی ہے۔

حمید کو اس عورت کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم تھا، اگر معلوم تھا تو صرف یہ کہ اس کی چال میں ایک محسوس ہو جانے والا شاہانہ انداز ہے، اس کے جسم میں ایک ایسی نزاکت ہے جو پھول کی پتھریوں میں تو ہوتی ہے لیکن جسم انسانی میں نہیں ہوتی، اس کی آنکھوں میں جو گہرائی اور سکون ہے وہ سات سمندروں کے علاوہ اور کہیں نہیں پایا جاتا۔ ہر روز وہ اسے گذرتے دیکھتا، اور جب وہ گذر جاتی، جب وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو کر پہاڑی سڑک کے موڑ میں گم ہو جاتی تو وہ ایسا محسوس کرتا جیسے سورج ڈوبنے سے پہلے ہی اس کے چاروں طرف تاریکی پھیل گئی ہے۔

حمید کا یہ بنگلہ آبادی میں نہیں تھا اور بنگلے کے بعد بھی کوئی آبادی نہ تھی۔ اسی لیے حمید اکثر سوچتا تھا کہ یہ عورت اس ویران سڑک سے گذرتی ہوئی آخر جاتی کہاں ہے؟ لیکن دن ہفتوں میں تبدیل ہوتے گئے اور حمید کو اس کے اس سوال کا جواب نہیں ملا۔ یقیناً وہ اس عورت کے دل آویز حسن اور پرکشش شخصیت کے سحر میں گرفتار ہو چکا تھا، لیکن چوں کہ اپنی بد صورتی کی وجہ سے وہ شدید قسم کے احساس کمتری میں مبتلا تھا، اس لیے اس میں اتنی اخلاقی جرأت ہی پیدا نہیں ہوئی کہ وہ اس کا تعاقب کرتا یا کسی دوسرے ذریعہ سے یہ معلوم کرتا کہ یہ عورت کہاں سے آتی ہے اور کہاں جاتی ہے؟ ابھی تو اسے اس عورت کا نام بھی معلوم نہیں ہوا تھا۔

قبرستان کے پھانک کی طرف دیکھتے ہوئے حمید نے سوچا، ”کتنے اچھے تھے وہ دن جاڑے کی کمر آلود راتوں سے بھی زیادہ دل کش دن۔ وہ دن جو اچانک کھو گئے، جو اچانک اس سے چھن گئے اور وہ صرف ان حسین دنوں کی یاد میں بھٹکتا رہ گیا۔۔۔ اور یہ سب اتنا اچانک ہوا جیسے کوئی نغمہ اچانک ٹوٹ جائے یا جیسے کوئی بادل برابر سے گذر جائے، جیسے تاریک رات میں بجلی چمکے اور سیاہ بلیاں اس کو دوبارہ دیوچ لیں۔

اور پھر ایک دن حمید نے ناہید سے گفتگو بھی کر لی اور اس کا نام بھی معلوم کر لیا۔ وہ شام اسے آج تک یاد تھی۔ بھلا وہ اپنی زندگی کی اس شام کو کیسے بھول سکتا تھا جب پہلی مرتبہ اس کی محبت نے زندگی کی انگڑائی لی تھی، جب پہلی مرتبہ اس نے ناہید کی گیتوں بھری آواز سنی تھی اور اس کے شبہم سے بھی زیادہ پاکیزہ وجود کو اپنے بالکل قریب دیکھا تھا۔

شام بادلوں کی گود میں جیسے سمٹ کر رہ گئی تھی۔ چاروں طرف سیاہ بادل گھرے ہوئے تھے۔ موسلا دھار بارش کے آثار تھے، حسب معمول وہ ہنگامہ کی بلندیوں پر کھڑا ناہید کا انتظار کر رہا تھا۔ وقت مقررہ پر وہ سڑک پر سے گذری، جھکی جھکی نگاہوں کے ساتھ لیکن دزدیدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتی ہوئی۔ منظر اتنا حسین تھا کہ حمید اس میں کھو کر رہ گیا۔ لیکن پھر اچانک تیز بارش آگئی اور اسے مجبوراً وہاں سے ہٹ جانا پڑا۔ اس نے چاہا کہ وہ نیچے سڑک پر جا کر اس عورت کو بھی بارش سے بچنے کے لیے اپنے ہنگامے میں پناہ لینے کی دعوت دے دے لیکن کوشش کے باوجود وہ خود میں اتنی ہمت نہ پیدا کر سکا۔

وہ ابھی اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اس عورت کے سحر خیز حسن کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک دروازے کی گھنٹی بجی۔ اسے حیرت ہوئی کہ اس موسلا دھار بارش میں اس سے ملنے آخر کون آسکتا ہے۔ لیکن جب اس نے دروازہ کھولا تو اس کی یہ حیرت مسرت میں تبدیل ہو گئی۔ سامنے وہی عورت کھڑی تھی جس کو وہ اپنے خوابوں کی ملکہ بنا چکا تھا، آج وہ پہلی مرتبہ اس عورت کو اپنے بالکل قریب دیکھ رہا تھا اس کی نیلی آنکھوں کی لابی لابی پلکیں بارش سے بھیگ کر کچھ اور زیادہ حسین ہو گئی تھیں۔ پتلے لب نہ مسکرانے کے باوجود مسکرا رہے تھے۔ برآمدے کے کھمبے کا سہارا لیے وہ کچھ اس انداز میں خم کھائے کھڑی تھی جیسے پہلی کا چاند زمین پر اتر آیا ہو۔

اس شام زندگی میں پہلی مرتبہ حمید کو یہ حقیقت زندہ روپ میں نظر آئی کہ عورت کا حسن میک اپ کا محتاج نہیں ہوتا۔ عورت حسین ہو تو اسے نہ غازہ کی ضرورت ہوتی ہے، نہ لب اسٹک کی، عورت نے اس سے نقرئی آواز میں کہا، ”کیا میں بارش رکنے تک آپ کے کمرے میں پناہ لے سکتی ہوں؟“ اور حمید نے ایسا محسوس کیا جیسے اس کے کمرے میں کوئی ملکوتی نغمہ بکھر گیا ہو، جیسے چوڑیاں کھنک گئی ہوں، پھر اس نے یہ سوچا کہ یہ عورت کب ہے، یہ تو چاند کی رو پہلی کرن ہے جو دروازہ کھول کر دبے پاؤں اس کے کمرے میں داخل ہو گئی ہے اور ہر طرف ایک روشنی سی پھیل گئی ہے۔

لیکن جب بھیگی ہوئی یہ عورت کرسی پر بیٹھنے کے لیے اس کے قریب سے گذری تو اچانک اس کی ناک میں ایک بو کی لہر سی آئی، ایک ایسی بساندھ جو عموماً ہلی کے جسم سے آتی ہے۔

اس وقت اس نے اس ”بو“ کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ عورت کے ساتھ اس کا

یوڑھلپ بھی تھا۔ اس نے دونوں کو آتش دان کے قریب بٹھادیا، دونوں کو گرم گرم کافی پلائی اور ان سے ذرا دور بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔ باتوں باتوں میں عورت نے اپنے بارے میں بہت سی باتیں بتادیں۔ ”میرا نام ناہید ہے۔ میں نینی تال کی رہنے والی ہوں۔ میری ماں رائے پور کی رہنے والی تھی۔ وہ مر چکی ہے۔ میں جلد ہی نینی تال جانے والی ہوں۔“

”میرا مکان یہاں سے دو میل دور ایک جنگل کے کنارے ہے۔“

”لیکن جنگل کے کنارے تو ایک پرانا قبرستان ہے۔“ حمید نے کہا۔

”جی ہاں، اسی قبرستان کے قریب ہی میں رہتی ہوں۔“

”بات یہ ہے کہ میرے باپ کو لبادی سے نفرت سی ہے۔“ ناہید نے جواب دیا۔

یہ بالکل اتفاق تھا کہ تمام رات بارش ہوتی رہی اور تمام رات ناہید اس کے چھوٹے سے بگھے کو جنت مہاتی رہی۔ تمام رات دونوں جاگتے رہے، ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے اور پھر جب صبح کو ناہید اس کے بگھے سے باہر نکلی تو خود ناہید بھی اس کو اپنا دل دے چکی تھی۔

حمید نے آج تک یہ نہیں سوچا تھا کہ ناہید نے ایک ہی رات میں اپنا دل اس کی نذر کیوں کر دیا تھا۔ وہ شام کو دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔ وہ وہ تمام دن اس کا انتظار کرتا رہا۔

ابھی حمید نے گذری ہوئی باتوں کے بارے میں یہیں تک سوچا تھا کہ ظفر گور کن کو لے کر آگیا۔ اور حال کی تلخیوں سے حسین ماضی کا ناطہ ٹوٹ گیا۔

”یہ ہے وہ قبر جس کا تذکرہ میں نے تم سے کیا تھا۔“ ظفر نے قبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گور کن سے کہا۔

”میں اس قبر کو اپنے بچپن سے جانتا ہوں صاحب۔“

گور کن نے سر دلچے میں جواب دیا۔ ”میں نے اس قبر کو ہمیشہ صاف ستھرا ہی پایا ہے۔“

”آخر کون اس قبر کو صاف کر جاتا ہے۔“

”یہ مجھے نہیں معلوم۔“ گور کن نے جواب دیا۔ ”اور اسی لیے میں اس قبر کے قریب بھی نہیں آتا۔ ایک مرتبہ میرے باپ نے مجھ سے کہا تھا کہ بھوت اس قبر کی رکھوالی کرتے ہیں اور رو حیں ہر رات کو اس قبر کی صفائی کر جاتی ہیں۔ میں نے خود اکثر تاریک راتوں میں قبرستان کے اندر رونے چلانے کی دردناک آوازیں سنی ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ یقیناً کوئی اس قبر کے پاس بیٹھ کر روتا ہے، اور دیر تک اس کی ہچکیوں کی

صدائے بازگشت فضا میں گونجتی رہتی ہے۔“

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد گورکن نے مزید کہا ”آپ یقین نہیں کریں گے جناب لیکن میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میں نے اکثر تاریکی میں اس قبر پر شمع جلتے دیکھی ہے، کبھی اس کے قریب سے گذرتے وقت لوبان کی ایک عجیب سی خوشبو محسوس کی ہے، اور ہر سال رجب کی ۲۳ تاریخ کو اس پر تازہ پھولوں کی ایک چادر بھی بچھی ہوئی پائی ہے اور اسی لیے تنہا میں اس کے قریب کبھی نہیں جاتا مجھے اس قبر سے ڈر لگتا ہے، اس کو دیکھ کر خدا معلوم کیوں میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور مجھے اچانک وہ دردناک چیخیں یاد آجاتی ہیں جو تاریک راتوں میں اس کے قریب سے بلند ہو کر فضا کو سو گوار بناتی رہتی ہیں۔“

”یہ چیخیں عورت کی ہوتی ہیں یا مرد کی؟“ سوال حمید نے کیا تھا۔

”ایک عورت کی چیخیں، جو ان عورت کی چیخیں، بالکل ایسی چیخیں جیسے کوئی بلی رو رہی ہو، کوئی بلی بن کر رہی ہو۔“

گورکن نے یہ جملہ کچھ اس انداز سے کہا تھا کہ ظفر اور حمید دونوں کے کلیجے کانپ کر رہ گئے۔

”کیا کبھی کوئی آدمی یا عورت دن کی روشنی میں بھی اس قبر پر فاتحہ پڑھنے یا لوبان سلگانے کے لیے آئی ہے؟“ ظفر نے چند لمحوں کے توقف کے بعد پوچھا۔



”جی ہاں۔ ہر جمعرات کو ایک عورت یہاں آتی ہے۔“

”کیا اس عورت نے کبھی تم سے کوئی بات چیت کی۔“

”جی نہیں، میں اس عورت سے بھی خوف زدہ ہوں۔ جب وہ قبرستان کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتی ہے تو میں اپنی کوٹھری میں گھس کر اس کا دروازہ اندر سے بند کر لیتا ہوں۔“

”تم اس عورت سے خوف زدہ کیوں ہو؟“ حمید نے پوچھا آپ ہی سوچئے جناب کہ ایک یحییٰ حسین عورت ایک پُراسرار قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لیے جو عورت ہر جمعرات کو خواہ آندھی ہو یا پانی، خواہ برف باری ہی کیوں نہ ہو رہی ہو، پابندی کے ساتھ یہاں آتی ہو، اس سے کون ہے جو خوف زدہ نہ ہو گا؟“..... اور پھر..... ”گورکن جیسے کچھ کہتے کہتے رک گیا۔“

”اور پھر کیا.....؟“ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ ظفر نے پوچھا۔

”اور پھر سرکار ایک دن میں نے چھپ کر اسے خوب غور سے دیکھا۔ اس کی

آنکھیں نہیں جھپکتی ہیں آپ یقین جانئے وہ کبھی اپنی آنکھیں نہیں جھپکاتی۔ وہ ہوا کے سرد جھونکے کی طرح آتی ہے اور پھول کی خوشبو کی طرح باہر نکل جاتی ہے۔ مجھے آج تک نہیں معلوم کہ وہ کہاں سے آتی ہے اور کہاں چلی جاتی ہے۔ میں نینی تال کے پئے بچے سے واقف ہوں لیکن میں نے اس کو نینی تال میں کبھی نہیں دیکھا۔ اب بتائیے ایسی عورت سے مجھے ڈرنا چاہیے یا نہیں۔“

گور کن نے اپنا جملہ پورا بھی نہیں کیا تھا کہ اچانک حمید کی نگاہیں سامنے والے درخت کے تنے پر پڑیں۔ اور پھر یہ دیکھ کر اس کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی کہ تنے کے سمارے ناہید کھڑی تھی۔

وہی اس کا پسندیدہ سفید لباس، وہی گلے میں پڑا ہوا جھلملاتا نیکلس، وہی کا جل لگی جھیل سے زیادہ گہری نیلی آنکھیں، وہی رخساروں پر لہراتی ہوئی باریک سی زلف، وہی مسکراتے لب۔

وہ واقعی نہ جھپکنے والی آنکھوں سے ان تینوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

حمید ایک بت کی طرح چند لمحوں تک ناہید کی طرف دیکھتا رہا۔ یہ وہی ناہید تھی جسے کبھی وہ اپنا مقصد حیات سمجھتا تھا۔ یہ وہی ناہید تھی جس کی قربت کبھی اس کے جسم میں زندگی کا تازہ خون دوڑا دیتی تھی۔ یہ وہی ناہید تھی جس کو پانے کے بعد وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس نے ساری دنیا کے پھولوں سے اپنا دامن بھر لیا ہے۔ لیکن آج وہی ناہید اس کی روح کی سب سے بڑی اذیت بن چکی تھی۔ حمید نے نظریں جھپکائیں تو ناہید غائب تھی۔

اور پھر جیسے حمید کو یہ یاد آگیا کہ اس کے پرس میں تو ہر وقت ناہید کی ایک تصویر موجود رہتی ہے۔ اس نے پرس نکالنے کے لیے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے گور کن سے پوچھا۔

”تم اس عورت کو کتنے دن سے، ہر جمعرات کو قبرستان آتے جاتے دیکھ رہے

ہو۔“

”تقریباً چالیس سال سے۔“ گور کن نے جواب دیا۔

”اس کا مطلب یہ کہ اب یہ عورت بوڑھی ہو چکی ہوگی۔“

”آپ بھی کمال کرتے ہیں صاحب! کبھی بھوت بھی بوڑھے ہوتے ہیں!“

”اگر تمہیں اس عورت کی کوئی تصویر دکھائی جائے تو کیا تم اس کو پہچان لو گے؟“

”ضرور۔۔“ گور کن نے حیرت سے جواب دیا۔ ”لیکن اس کی تصویر ملے گی

”میں تمہیں اس کی تصویر دکھاتا ہوں۔“ اتنا کہہ کر حمید نے جیب سے پرس نکال کر اسکی زپ کھولی، اور ناہید کی تصویر گور کن کے سامنے کر دی۔

گور کن پھٹی پھٹی نظروں سے اس تصویر کو دیکھتا رہا اور پھر اس کے منہ سے ایسی گھٹی گھٹی چیخیں نکلنے لگیں جیسے ان دیکھے ہاتھ اس کا گلا گھونٹنے دے رہے ہوں۔ حمید اور ظفر نے گھبرا کر پہلے گور کن کی طرف دیکھا اور پھر پرس میں لگی ہوئی تصویر کی طرف..... لیکن یہی وہ لمحہ تھا جب نہ دکھائی دینے والے ہاتھوں نے دھیرے دھیرے تصویر کو پرس سے نکال لیا تھا۔

تصویر پرس میں سے غائب ہو چکی تھی۔

گور کن اب بھی چیخے جا رہا تھا۔ چیخ ہی نہیں رہا تھا زمین پر گر کر تڑپ بھی رہا تھا..... ظفر اور حمید دونوں نے جھک کر گور کن کو سنبھالنا چاہا، لیکن گور کن زمین پر گرنے کے بعد بالکل بے ہوش ہو چکا تھا، بے ہوشی ایسی تھی جیسے وہ مر گیا ہو، لیکن وہ مرا نہیں تھا، ظفر نے اس کی نبضیں دیکھیں، نبض کی رفتار سست ضرور تھی، لیکن ڈوبی نہیں تھی۔

اور پھر دونوں چونک سے گئے، ان کے بالکل قریب سے آواز آئی ”میں چاہتی تو اس کو ابھی مار سکتی تھی، لیکن میں نے محض حمید کی وجہ سے اس کا قتل نہیں کیا کیوں کہ گور کن کی لاش ظفر کے ساتھ حمید کو بھی جیل بھجوا سکتی تھی۔“

”سامنے آؤ ناہید۔“ حمید نے ڈرے بغیر کہا ”اب جب کہ تمہارا اصل وجود بالکل ننگا ہو چکا ہے اور تم اپنی تمام تر خباثتوں کے ساتھ کھل کر سامنے آچکی ہو تو تمہیں مجھ سے چھپنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”یہ تمہاری غلط فہمی ہے حمید“ ناہید کی آواز ہوا میں سرسرائی ”میں خبیث نہیں ہوں، تم میرے بارے میں اگر تمام باتیں جان جاؤ تو تمہیں بھی مجھ سے ہمدردی ہو جائے۔“

”مجھے اب تم سے قیامت تک ہمدردی نہیں ہو سکتی، میں نہیں مان سکتا کہ تم خبیث نہیں ہو، تم عورت بھی ہو اور بلی بھی، تم سینکڑوں برس سے زندہ ہو اور لمبی عمر نے تمہارے جسم اور تمہارے رنگ روپ پر کوئی اثر نہیں ڈالا ہے۔ میں حیران ہوں کہ جب اس دنیا کے ہر جان دار کو فنا ہونا ہے تو تم اب تک باقی کیوں ہو؟ تم بھوت ہو، تم ڈائن ہو، تم ایک ایسی ناپاک اور خبیث روح ہو جو دنیا میں صرف خباثت پھیلایا کرتی ہے، مجھے تم سے نفرت ہے ناہید۔“



حمید نے یہ جملے اس انداز سے کہے کہ خود ظفر بھی حیران ہو کر حمید کی طرف دیکھنے لگا، لیکن ابھی اس کی یہ حیرت ادھوری تھی، کیوں کہ دوسرے ہی لمحے اس نے جو منظر دیکھا اس نے اسے صرف حیرت زدہ ہی نہیں کیا، چند لمحات کے لیے غم زدہ بھی کر دیا۔

ابھی حمید کے جملوں کی صدائے بازگشت بھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ناہید ان دونوں کے بالکل قریب کھڑی تھی، لیکن اس وقت اس کے چہرے پر نہ کوئی نفرت تھی، نہ غصہ، نہ بھانک پن تھا اور نہ خوف زدہ کرنے والا تاثر۔

ناہید کی آنکھوں سے بے تحاشہ آنسو بہہ رہے تھے، وہ پہلی مرتبہ ناہید کی آنکھوں میں آنسوؤں کی لرزتی بوندیں دیکھ رہا تھا، ایک خونخوار وجود پلک جھپکتے میں عورت بن چکا تھا، ایک مکمل عورت، جس کے آنسوؤں میں دنیا کی سب سے بڑی طاقت مضمر ہوئی ہے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ ظفر کے دل میں ناہید کو دیکھنے کے باوجود اس کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا نہیں ہوا، وہ ناہید سے ڈرا بھی نہیں، بس وہ حیران اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے ناہید کی طرف دیکھتا رہا، اس ناہید کی طرف جو اس کی سب سے بڑی دشمن تھی، لیکن جس کے آنسوؤں نے پورے ماحول کو سو گوار بنا دیا تھا۔

حمید اور ظفر دونوں آنسو بہانی ناہید کی طرف دیکھتے رہے۔ ناہید نے واقعی بڑے ڈرامائی انداز میں حمید اور ظفر کی نفرت کو ہمدردی میں تبدیل کر لیا تھا، وہ روتی ہی رہی، اور آنسو اس کے رخساروں کو تر کرتے رہے۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا ناہید کہ تم چاہتی کیا ہو؟“ حمید نے پہلے کی بہ نسبت ذرا نرم لہجے میں پوچھا۔

”مجھے تمہاری محبت اور ظفر کی نفرت نے دیوانہ کر دیا ہے۔“

”حمید۔“ ناہید نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں، اور یہ چاہتی ہوں کہ ظفر کو تڑپا تڑپا کر موت کے حوالے کر دوں۔“

”لیکن کیوں۔۔۔؟“ حمید کا لہجہ دوبارہ سخت ہو گیا، ”تم ظفر کی موت کیوں چاہتی ہو؟“

”اس لیے کہ اس نے میرے انسانی وجود کا جو میں نے برسوں کی ریاضت کے بعد حاصل کیا تھا خاتمہ کر دیا ہے، یہ ٹھیک ہے کہ میں ایک بلی تھی، لیکن یہ بھی ٹھیک ہے کہ میں ایک عورت بھی تھی اور حمید میرے عورت ہونے سے تمہیں بھی انکار نہ ہو گا۔“

”تم ظفر کو قتل کرنا چاہتی ہو تو تم نے اسے اب تک قتل کیوں نہیں کیا؟“ حمید نے پوچھا۔

”تم میری مافوق الفطرت طاقتوں سے واقف ہو چکے ہو، میں چاہتی تو کبھی کا ظفر کو قتل کر چکی ہوتی لیکن میں اسے تڑپا تڑپا کر مارتا چاہتی ہوں۔“

ظفر خاموشی سے ان دونوں کی گفتگو سنتا رہا، منظر واقعی عجیب و غریب تھا، پرانے قبرستان کے ایک ویران گوشے میں ایک پراسرار قدیم قبر کے قریب دو انسان، دو جیتے جاگتے انسان ایک روح سے گفتگو کر رہے تھے، ایک ایسی روح سے ہم کلام تھے جو کبھی ایک جسم کی مالک تھی، جس کا خود ایک اپنا وجود تھا، جو پھول کی طرح مسکراتی تھی۔ اور باد نسیم کی طرح اٹھلایا کرتی تھی۔

ظفر مسلسل ناہید کی طرف دیکھ رہا تھا، اور اچھی طرح محسوس کر رہا تھا کہ وہ جس وجود کو دیکھ رہا ہے اس کی حیثیت ایک دھوئیں کے ہیولے سے زیادہ نہیں ہے، لیکن اس ہیولے میں کتنی طاقت تھی بے ہوش گورکن کی نیم مردہ لاش اس کا تازہ ثبوت بنی اس کی نگاہوں کے سامنے پڑی تھی۔

لیکن ناہید نے ایک لمحہ کے لیے بھی ظفر کی طرف نہیں دیکھا تھا وہ صرف حمید کی طرف دیکھ رہی تھی اور حمید ہی سے مخاطب تھی جیسے اس کے نزدیک ظفر قبرستان میں موجود ہی نہیں تھا۔

”کیا ایسا ممکن ہے کہ تم ظفر کے بارے میں اپنا فیصلہ بدل دو۔“

اچانک حمید نے پوچھا۔

”ہاں ممکن ہے۔“ ناہید نے کہا۔ ”لیکن میری بھی ایک شرط ہے۔“

”اپنی شرط بتاؤ۔“ حمید نے خلاف توقع مسکراتے ہوئے کہا۔

”تم اور ظفر دونوں مل کر مجھے میرا انسانی وجود واپس لا دو اور یہ وعدہ کرو کہ جب

میں دوبارہ ناہید بن جاؤں گی تو تم دوبارہ مجھ سے شادی کر لو گے۔“

”کیا ایسا ممکن ہے کہ تم دوبارہ ایک انسانی جسم اختیار کر لو؟“

”ہاں۔۔۔“ ناہید نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔

”کیسے ممکن ہے؟“ یہ سوال حمید نے کیا تھا۔

”وہ میں تمہیں بتا دوں گی۔“ ناہید نے بڑے ہلکے لہجے میں کہا،

”لیکن اس کے لیے تمہیں میرے ساتھ میری آبائی حویلی چلنا پڑے گا۔“

”لیکن کب۔۔۔؟“



”تم چاہو تو ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ چل سکتے ہو۔“  
اس جملے کے ساتھ ہی ناہید کا ہیولہ دیکھتے دیکھتے فضاء میں تحلیل ہو گیا۔  
”میں تیار ہوں۔۔۔“ حمید نے جلدی سے جواب دیا۔ ”لیکن پرانی حویلی تک ہم دونوں کی رہبری کون کرے گا۔“

”ظفر۔۔۔“ فضا میں آواز گونجی۔ ”وہ میرے یہاں آچکا ہے۔“  
دونوں دوست ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے، گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ فیصلہ کر لینا چاہتے ہوں کہ انہیں ناہید کی شرط مان لینا چاہئے یا نہیں۔  
ظفر نے کہا ”ناہید نے ٹھیک ہی کہا ہے مجھے اس کی لپائی حویلی کا راستہ یاد ہے۔۔۔“  
لیکن اہم سوال یہ ہے کہ کیا واقعی تم نے اس کی خطرناک شرط قبول کر لی ہے؟“  
”فی الحال میں اس سوال کا جواب دینا نہیں چاہتا،“ حمید نے جواب دیا۔  
”لیکن میں تمہارے واضح جواب کے بغیر حویلی کی جانب قدم نہیں اٹھاؤں گا۔“  
ظفر نے ایک فیصلہ کن لمحے میں کہا۔

”تم خوب جانتے ہو ظفر کہ میں اگر اس کی شرط قبول کروں گا بھی تو محض تمہاری سلامتی کی خاطر۔“

”اور یہی میں نہیں چاہتا ہوں۔“ ظفر نے دو ٹوک جواب دیا۔  
”میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے زندہ دیکھنے کے لیے خود کو ایک بھوت کے حوالے کر دو، ایک خوں خوار ملی کے سپرد کر دو، ایک ایسی خبیث روح کے رحم و کرم پر ہو جاؤ جو بظاہر سینکڑوں برس سے زندہ ہے اور جس کے ارادوں کے بارے میں ہمیں کچھ بھی نہیں معلوم میں اپنی زندگی کے لیے تمہاری زندگی کو جہنم نہیں بنانا چاہتا حمید۔“  
”لیکن میں تمہیں زندہ دیکھنا چاہتا ہوں ظفر۔“

”زندگی اور موت خدا کے اختیار میں ہے حمید اور مجھے یقین کامل ہے کہ میری موت ناہید کے ہاتھوں نہیں لکھی ہے بلکہ ناہید کی طویل اور خبیث زندگی کا خاتمہ میرے ہاتھوں ہونا ایک مقدر بن چکا ہے۔“

لیکن حمید نے ظفر کی اس بات کا اس وقت کوئی جواب نہیں دیا کیوں کہ گور کن رفتہ رفتہ ہوش میں آ رہا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے اس نے آنکھیں کھول دیں

حمید نے اس کو سہارا دے کر بیٹھایا حمید چاہتا تھا کہ گور کن سے کچھ اور باتیں کریں اس سے جیسے یہ پوچھ لیں کہ وہ تصویر دیکھ کر ایک ذبح ہوتے ہوئے بحرے کی طرح چیخا کیوں تھا؟ لیکن گور کن کھڑا ہوتے ہی وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا، اس نے پلٹ

کر ان دونوں کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

”او چلیں ظفر۔“ حمید نے کہا۔

”کہاں۔؟“ ظفر نے پوچھا۔

”ناہید کی حویلی کی طرف۔“ حمید نے جواب دیا۔ ”جب تم یہ کہہ چکے ہو کہ زندگی اور موت خدا کے اختیار میں ہے اور جب تمہارا یہ یقین ہے کہ خدا کے بعد انسان دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے تو تم انجام سے ڈرتے کیوں ہو؟۔“

اب ظفر لا جواب ہو چکا تھا اس لیے وہ حمید کے دوبارہ اشارہ کرنے پر اس سمت روانہ ہو گیا جدھر ناہید کی حویلی تھی آسیب زدہ حویلی، وہ حویلی جس کے در و دیوار سے وحشت ٹپکتی تھی اور جس کو اس نے نیم بے داری کی حالت میں دیکھا تھا۔

ظفر اور حمید ایک دوسرے سے گفتگو کئے بغیر چلتے رہے اور انہیں اس کا پتہ بھی نہ چلا کہ خود ناہید کا نہ دکھائی دینے والا وجود ان کے آگے آگے چل رہا ہے، لیکن اگر وہ دونوں اس وقت ناہید کو دیکھ لیتے تو یقیناً ان کو وہ زہریلی مسکراہٹ بھی نظر آ جاتی جو اس وقت ناہید کے باریک لبوں پر کھیل رہی تھی اور پھر شاید وہ حویلی جانے کے سلسلے میں اپنا ارادہ بھی بدل دیتے۔

ناہید ان دونوں کے آگے آگے چل رہی تھی، مڑ مڑ کر دیکھتی ہوئی، لبوں پر زہریلی مسکراہٹ بکھیرتی ہوئی، آنکھوں میں ناگنوں کی سی چمک لہراتی ہوئی، بالکل اس طرح جیسے ہوا چل چل کر چل رہی ہو، ناہید اس وقت خلاف معمول بے حد خوش نظر آرہی تھی، بے حد مسرور ایسی شاداں جیسے اس کا مطلوب اسے مل گیا ہو، جیسے اس کی پیاس بجھ گئی ہو، جیسے اسے اس کی کوئی کھوئی ہوئی چیز مل گئی ہو۔

ظفر اور حمید منزل کی طرف بڑھتے گئے اور منزل نزدیک آتی گئی۔



ادھر نینی تال میں ظفر کی منگیت پریشان تھی کہ ظفر اور حمید اب تک کیوں نہیں آئے؟ آج کل وہ بھی سیر و تفریح کی غرض سے اور اپنے محبوب ظفر کی خبر گیری کے لیے اس کے پاس ہی چلی آئی تھی۔ جب کافی دیر گزر گئی تو وہ تھک ہار کر کچھ دیر آرام کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی انجانی قوت اس کو تھکائے دے رہی ہے، اس کے اعصاب کو مضحمل کئے دے رہی ہے، جیسے وہ تھکتی جا رہی ہے، جیسے اسے نیند آئے جا رہی ہے، اور پھر شبانہ واقعی تھک کر پلنگ پر لیٹ بھی گئی، لیٹنے سے قبل اس نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

بہر حال وہ ملی کے وجود سے خوف زدہ تھی۔

ظفر نے اس کو زیادہ حالات نہیں بتائے تھے، وہ ملی کے بارے میں زیادہ تفصیل سے واقف بھی نہ تھی لیکن اس کے باوجود جب بھی وہ سیاہ ملی کے بارے میں سوچتی، جیسے اس کی رگوں میں دوڑنے والا خون سرد ہونے لگتا، اس کے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے اور وہ دل ہی دل میں کانپ کر رہ جاتی۔

رفتہ رفتہ وہ یہ محسوس کرنے لگی جیسے بند کمرے میں اس کے علاوہ بھی کوئی دوسرا موجود ہے، ابتدا میں اس نے اس کو اپنا وہم ہی سمجھا کیوں کہ وہ اچھی طرح دیکھ چکی تھی کہ کمرے کے تمام دروازے اور کھڑکیاں اچھی طرح اندر سے بند ہیں۔

مزید اطمینان کے لیے اس نے الماریاں بھی کھول کر دیکھ لیں پردوں کو ہٹا کر دیکھا، پلنگ کے نیچے دیکھا اور جب اسے اچھی طرح یقین ہو گیا کہ کمرے میں اس کے علاوہ کوئی پرندہ تک موجود نہیں ہے تو وہ پلنگ پر لیٹ گئی، اس نے منہ پر چادر ڈال لی، لیکن

ابھی اس کو آنکھیں بند کئے مشکل سے پانچ منٹ ہوئے ہوں گے کہ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کمرے میں کوئی چیز دھم سے گری شانہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔  
کمرہ بالکل خالی تھا۔

دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ وہ دوبارہ پلنگ پر لیٹ گئی اور اب اس کو واقعی ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس پر گہری نیند کا غلبہ ہو رہا ہے، اسی عالم غنودگی میں اس نے مختلف قسم کی آوازیں سنیں، جیسے دور بہت دور کوئی چیخ رہا ہو، یا جیسے کوئی درد سے کرا رہا ہو، یا جیسے کوئی اس کے کان میں کچھ کہہ رہا ہو۔  
اچانک گھبرا کر اس نے دوبارہ آنکھیں کھول دیں۔

اور پھر جیسے اس کی کھگھی سی بندھ گئی، اس نے چیخنا چاہا لیکن وہ چیخ بھی نہ سکی۔۔۔ شانہ کے پلنگ کے بالکل نزدیک ایک عورت موجود تھی، انتہائی خوب صورت لیکن بالکل ساکت، وہ اپنی نہ جھپکنے والی آنکھوں سے اس کی طرف مسلسل دیکھے جا رہی تھی اور اس کا سفید لباس اس طرح خوش بو بھیر رہا تھا جیسے وہ ابھی اپنی قبر سے اٹھ کر آئی ہو۔

ایک ہی نظر میں شانہ نے دیکھ لیا کہ یہ عورت لباس کے بجائے جیسے سفید کفن ہی پہنے ہو۔ عورت دھیرے دھیرے اس کے بالکل قریب آگئی، اتنا قریب کہ وہ اب لباس کی بو بھی محسوس کرنے لگی تھی۔

عورت کے قدموں کی کوئی آواز بھی کمرے میں بلند نہیں ہوئی تھی، شانہ دم سادھے پڑی رہی، اس کے اعصاب جواب دے چکے تھے، حلق خشک ہو چکا تھا اور آواز جیسے اس کے گلے میں پھنس کر رہ گئی تھی، اس نے چیخنا چاہا لیکن وہ چیخ بھی نہ سکی۔

نزدیک آکر وہ عورت اس کے چہرے کی طرف جھکی اور پھر کمرے کی نیم تاریکی میں شانہ نے جب غور سے دوبارہ اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو جیسے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ کیوں کہ اب اس عورت کا چہرہ بدل چکا تھا۔ محض چند لمحات تک اس کا چہرہ ایک خوب صورت عورت کا چہرہ تھا لیکن اب یہ چہرہ ایک سیاہی کا چہرہ تھا۔ چہرہ ہلکا اور جسم عورتوں کا، شانہ کو اس کے بعد کچھ بھی یاد نہ رہا۔

وہ پوری طرح بے ہوش ہو چکی تھی۔  
ٹھیک اسی وقت حمید اور ظفر چلتے چلتے ناہید کی آسیب زدہ حویلی کے قریب پہنچ چکے تھے، یہ نیم مسمار شدہ حویلی اپنی تمام وحشت ناکوں کے ساتھ بالکل اسی طرح

موجود تھی جس طرح ظفر نے ۲۴ گھنٹے بل دیکھی تھی۔  
 ”تم یہیں آئے تھے؟“ حمید نے یہ ایکپاتی نظر حویلی کی شکستہ دیواروں اور جھکی ہوئی محرابوں پر ڈالتے ہوئے ظفر - بوجھا۔

”ہاں۔“ ظفر نے یک۔ سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اور میرا خیال ہے کہ سینکڑوں برس بعد میں پہلا زندہ آدمی ہوں جو اس میں زندہ داخل ہوا تھا۔“  
 ”او.....“ حمید نے ظفر کو چلنے کا اشارہ دیتے ہوئے کہا لیکن ظفر جیسے پھر رک گیا اس نے کہا، ”حمید میرا دل کہہ رہا ہے کہ ہم اس حویلی میں داخل ہو کر کچھ اچھا نہیں کر رہے ہیں۔“

”تم پھر بہنے لگے۔“ حمید نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا، ”کم از کم اتنا تو سوچو کہ میں یہ سارا خطرہ محض تمہارے اور صرف تمہارے مفاد کے پیش نظر مول لے رہا ہوں۔“

”مجھے اس کا اعتراف ہے دوست، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ مجھے یہ بھی کہہ لینے دو کہ ناہید کے شوہر ہونے کے باوجود تم ناہید سے اتنا واقف نہیں جتنا کہ میں ہوں، میں خوب جانتا ہوں کہ وہ خبیث ہے، بد نفس ہے، آوارہ ہے بھٹک گئی ہے اور تم خود سوچو کہ ایک ملی جو عورت بن گئی ہو، ایک عورت جو برس ہا برس سے زندہ ہو اور جس کے بارے میں ہمیں کچھ بھی نہیں معلوم ہو اس پر اتنا شدید بھروسہ کرنا عقل مندی کب ہے۔“



”میں ان تمام امور پر غور کر چکا ہوں ظفر.....“ حمید نے کہا۔

”تم نے سب کچھ ٹھیک کہا ہے لیکن اس کے باوجود یہ بھی ایک زندہ حقیقت ہے کہ یہی کالی ملی یہی خوف ناک روح ایک عوت کے روپ میں ایک عرصہ تک میری بیوی رہ چکی ہے اور آج بھی میری محبت میں دیوانوں کی طرح پھرا کرتی ہے، مجھے پورا یقین ہے کہ وہ ہم میں سے کسی کو نقصان نہیں پہنچائے گی۔“

حمید نے اپنا جملہ پورا ہی کیا تھا کہ اچانک ناہید اپنی حویلی کے مسمار شدہ دالان میں نظر آگئی، یہ دالان اس جگہ سے صاف نظر آرہا تھا، دونوں ناہید کو دیکھ کر چونک سے گئے اور چونکتے کیسے نہ جب کہ اب ناہید ان دونوں کی جانب ہی آرہی تھی، اس کی چال میں اتنی نزاکت تھی کہ ایک لمحہ کے لیے حمید اسی طرح طویل سانس لے کر رہ گیا جیسے رائے پور کی اس پہاڑی پر جب اس نے ناہید کو پہلی بار دیکھا تھا۔

”او حمید“ ناہید نے مسکرا کر کہا، ”میں بڑی دیر سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔“

”یقین نہیں آتا ناہید کہ تم مر چکی ہو۔“ حمید نے جواب دیا۔  
 ”اے کاش تم نہ مری ہو تیں۔“

”میں مری نہیں ہوں، صرف میرا ایک خیالی وجود ختم ہوا ہے میری پوری داستان سننے کے بعد میرے ماضی میں جھانکنے کے بعد خود تم یہ کہنے پر مجبور ہو جاؤ گے کہ میں مری نہیں ہوں، میں زندہ ہوں، بالکل تمہاری طری، بالکل ظفر کی طری،“ ناہید نے بڑے ٹھنڈے لہجے میں زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور ایک مرتبہ پھر دونوں کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔

اب حمید اور ظفر انکار کرنے کی ہمت کھو چکے تھے ناہید کی چمک دار آنکھوں نے جیسے ان پر ایک سحر سا کر دیا تھا دونوں جواب دیئے بغیر حویلی کے احاطے میں داخل ہو گئے، ناہید ان کے آگے آگے چلتی رہی اور پھر اچانک حویلی کے بالکل سامنے آکر رک گئی اب اس نے کہا ”یہ میرے جد امجد نواب ذیشان جنگ کی بہائی ہوئی حویلی ہے حمید، انہوں نے دنیا کے جھمیلوں سے تنگ آکر پہاڑ کے اس ٹھنڈے گوشے میں جب کہ یہاں سینکڑوں میل دور تک کوئی آبادی نہ تھی دہلی سے آکر یہ حویلی ہوائی تھی اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ زندگی کے آخری دن یہیں گزارے تھے۔“

حمید اور ظفر حیرت سے ناہید کی طرف دیکھتے رہے وہ کہتی رہی۔ ”اسی حویلی میں آج سے تین سو سال قبل میری پیدائش ہوئی تھی یہیں میرا لڑکپن بیتا تھا، یہیں میں جوان ہوئی تھی اور یہیں میں دلہن بنی تھی۔“

”دلہن.....!“ بے ساختہ حمید کے منہ سے نکل گیا۔

”ہاں دلہن..... اور جانتے ہو میرا دولہا کون تھا، میرا دولہا..... میرا دولہا تم

تھے حمید..... ہاں تم.....“ وہ بولی۔

لیکن شادی سے چند روز قبل میرے ہونے والے دولہا..... میرے محبوب کو رقابت میں ہمارے ہی ایک عزیز نے قتل کر دیا۔ اس صدمے سے میں پلنگ پر پڑ گئی۔ روز بہ روز میری حالت گرتی چلی گئی۔ میرے دل میں غم و الم اور دماغ میں انتشار کا ایک طوفان برپا تھا۔ دنیا میری نگاہ میں تاریک ہو چکی تھی۔

ایک روز حویلی میں میرے والد کے ایک دوست کا آنا ہوا۔ ان کا نام فوہی تھا اور میں انہیں ”فوہی انکل“ کہا کرتی تھی۔ ان کا تعلق سر زمین چین سے تھا۔ بلاشبہ وہ ایک پر اسرار ہستی کے مالک تھے اور اپنے حیرت انگیز کارناموں کی بدولت دور دور تک مشہور ہو



چکے تھے۔

اپنے ابتدائی دور میں اس شرعہ آفاق ہستی نے موت و حیات کے حقائق پر سے سرمستہ رازوں کی تاریک چادر کو اٹھانے کا عزم کیا تھا۔ چنانچہ جب اسے اس بات کا علم ہوا کہ دنیا کے سب سے اونچے پہاڑ ہمالیہ کے دامن میں ایک ایسی وادی بھی ہے جو قدیم تہذیب کا گہوارہ رہ چکی ہے اور وہاں اس دور میں بھی ایسے مذہبی پیشوا مل جاتے ہیں جو موت کے بھیانک فلسفے کو حل کر چکے ہیں نیز وہاں کی سب سے بڑی خانقاہ میں رہنے والا لامہ (سربراہ) موت کے رازوں پر فتح حاصل کر چکا ہے اور اس سلسلے میں اس نے تمام رازوں کو سمجھ لیا ہے جو موت و فنا سے خصوصی تعلق رکھتے ہیں تب وہ اس پراسرار وادی میں پوشیدہ طور پر داخل ہو گیا۔ اس نے وہاں پہنچتے ہی سب سے پہلے وہاں بھکشوؤں سے تعلقات قائم کئے۔ اس کے بعد اس نے رفتہ رفتہ ان سے ممکنہ حیات کے راز حاصل کیے۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد اس نے وادی نیل کارخ کیا۔ وہاں اس نے ایک ایسے پراسرار بوڑھے کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا جو صدیوں سے زندہ تھا اور پوشیدہ علوم کا ماہر تھا۔ چنانچہ فوری برسوں اس کے ساتھ رہ کر اپنے مقصد میں بالآخر کامیاب ہو گیا اور دائمی حیات کا کھوج لگا ہی لیا۔

جب انہیں میرے بارے میں علم ہوا تو مزاج پر سی کے لیے میرے پاس آگئے۔ انکی شفقت و محبت سے چند ہی دنوں میں میری طبیعت قدرے بحال ہو گئی۔ اور میں چلنے پھرنے لگی۔

اپنے والد سے چھپ چھپ کر درپردہ میں نے ان کی شاگردی اختیار کر لی اور ان سے دائمی حیات کے بارے میں علم حاصل کرتی رہی۔ بالآخر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی۔ اب میں اپنی ہیئت بدلنے پر بھی قادر تھی۔ اب میں اپنے آپ کو درندوں اور جانوروں کے روپ میں رات کے وقت چاند کے مختلف مراحل کے ساتھ تبدیل کرنے کی قوت اور صلاحیت بھی رکھتی تھی اور اس نئے روپ میں دوسرے انسانوں کے لیے تباہی اور مصیبت من سکتی تھی۔ لیکن میں آفت کا پرکالا ان لوگوں کے لیے ہوں جو میرے روپ بہ روپ کو آشکارہ کریں خواہ وہ کوئی بھی ہو اس کا خون پی جاؤں گی۔

ایک دن میں نے ان کے سامنے اپنے دل کی بات عیاں کر دی تو انہوں نے وعدہ کیا کہ اس سلسلے میں اپنے علم کے ذریعے حساب لگا کر کچھ دنوں کے بعد آگاہ کریں گے۔ پھر ایک روز مجھے اپنے پاس بٹھا کر کہنے لگے۔

”بیٹی! تمہیں اپنے محبوب کو اپنانے کا حق بخشا جاتا ہے۔ تم اسے ضرور اپناؤ گی، لیکن

کب، کس حالت اور کس دنیا میں..... فی الحال یہ بتانا دیوتاؤں کے اسرار سے بعید ہے۔ البتہ اس وقت تک تم زندہ رہو گی اور اسی طرح حسین و جوان رہو گی۔ تین سو برس بعد تمہارا بھگڑا ہوا محبوب دوبارہ تم سے ملے گا۔“

کچھ عرصے بعد انکل فوہی چلے گئے..... میرے والد کا انتقال ہو گیا البتہ میں اپنے محبوب کو دوبارہ پانے کے لیے زندہ رہی۔ پلک جھپکتے تین سو سال گزر گئے۔ میرے عظیم ترین خواب کی تعبیر کے پورا ہونے کا وقت آپہنچا اور میں تمہیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ پھر میں تمہاری دلہن بن گئی۔

مجھے پہچانو حمید..... میرے محبوب..... میں تمہاری وہی ناہید ہوں جس سے تم بے پناہ پیار کرتے تھے۔ تین سو سال تک میں تمہارا انتظار کرتی رہی۔ میرا دل کہتا تھا کہ ایک دن ہم پھر ایک ہو جائیں گے۔ دیکھو آج ہم دونوں ایک دوسرے کے روبرو ہیں۔

حمید بڑی حیرت سے ناہید کی باتیں سن رہا تھا۔ یہ کہتے کہتے ناہید اس قدر جھکی کہ اس کے ہونٹ حمید کی پیشانی سے ذرا ہی دور تھے۔ دونوں کی نگاہیں ایک ساعت کے لیے آپس میں ٹکرا گئیں۔ حمید نے اپنی قلبی کیفیت ناہید پر بالکل ظاہر نہ ہونے دی اور پیار محبت کا اظہار کرتا رہا۔ ناہید بہت خوش تھی کہ اس نے کھو کر اپنا محبوب پھر پایا ہے۔

”میرے محبوب! ہمارے لیے یہ آزمائشی دور ہے۔ ہمیں اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ہم دونوں کل بھی ایک تھے۔ آج بھی ایک ہیں اور آئندہ بھی ایک ہی رہیں گے۔“

اپنے ماضی کو یاد کرو حمید..... ماضی ہمارا شاندار ماضی..... ہماری زندگی کا سنہری عہد..... یاد کرو وہ عہد و پیمان وہ رومان کے دن رومان کی راتیں..... یاد کرو.....“

ناہید خاموش ہو کر جواب طلب نظروں سے حمید کی طرف دیکھنے لگی۔ لیکن حمید کوئی جواب دینے کی بجائے اسے دیکھتا رہا۔



اس کے بعد حمید نے ناہید کے سامنے یہ شرط رکھی کہ وہ ظفر اور شبانہ کو قید سے آزاد کر کے بمبئی واپس جانے دے، پھر پہلے کی طرح میاں بیوی بن کر رہ سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ اس نے ظفر کو بھی بھلایا کہ وہ شبانہ کو اپنے ساتھ لے کر بمبئی چلا جائے اور آئندہ ناہید کے بارے میں سوچنا چھوڑ دے۔ چنانچہ اپنے دوست کے پیہم اصرار پر ظفر شبانہ کے ہمراہ بمبئی کے لیے روانہ ہو گیا۔

حمید دوبارہ اپنی خوب صورت بیوی ناہید کے ساتھ رہنے لگا تھا۔ لیکن اب اس کا انداز کچھ اور تھا۔ اس کے دل و دماغ پر صرف ایک ہی خلش کنڈلی مارے ناگ کی طرح جمی رہ گئی تھی کہ ناہید جو سینکڑوں برس سے زندہ ہے، نہ جانے اس نے کتنے گھر اجاڑے ہوں گے، کتنے جوانوں کا خون پیا ہو گا لہذا اب اسے مٹا کر آنیوالی نسلوں کو اس کی شیطانی قوتوں سے بچانا چاہیے۔

اس سوچ و چار میں کئی روز گزر گئے۔ لیکن وہ موقعہ کی تاک میں تھا۔ بالآخر ایک ترکیب اس کے ذہن میں آہی گئی۔

ایک روز ناہید کو ساتھ لے کر کچھ دنوں کے لئے مینی تال سے کسی دوسرے مقام پر تبدیلی آب و ہوا کے لیے چلا گیا۔ اور جانے سے پہلے اس نے اپنے وفادار ملازم کو تاکید کر دی تھی کہ ناہید کی خواب گاہ کا فرش کھدوا کر تقریباً دس فٹ کی گہرائی میں اس کی موت کا انتظام کرے۔ چنانچہ ان کی روانگی کے فوراً بعد ملازم نے اپنے آقا کی ہدایات کے مطابق کام شروع کر دیا اور ان کے آنے سے پہلے کام مکمل ہو چکا تھا۔

مطابق کام شروع کر دیا اور ان کے آنے سے پہلے کام مکمل ہو چکا تھا۔

جہاں ناہید کا پلنگ پڑا رہتا تھا وہیں سے فرش کی گہری کھدائی شروع ہوئی تھی اور دس فٹ کی گہرائی میں ڈیڑھ فٹ لمبے آہنی تیروں کا بستر سا لگوا دیا۔ ہر دو تیروں کے درمیان چار انچ کا فاصلہ بھی رکھا تھا۔ سرہانے اور پائنتی کی جانب دو دو پلاسٹک کے بنے ہوئے پٹرول بھرے گیلن بھی اس انداز میں رکھ دیئے تھے کہ انگلی کے ہلکے سے اشارے سے دونوں گیلن کے کاک ہٹ جائیں اور سارا پٹرول بکھر جائے۔

یہ سب کچھ حمید نے اس لیے کیا تھا کہ بدروحوں کو آگ کے بغیر ختم نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اب حمید نے اپنا ذہن خالی رہنے دیا۔ ظاہری طور پر صرف ناہید کی محبت کا سمندر ہی ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس تبدیلی پر ناہید کو بڑی خوشی ہوئی۔ اور اس خوش فہمی میں اس نے اپنی ماورائی قوتوں سے قطع نظر سپردگی کی انتہائی حدوں کو چھو لیا۔ نیز سپردگی کی بے خودی میں وہ حمید کی طرف سے ہر قسم کے خطرے سے بے نیاز ہو گئی۔

ایک رات جب ناہید نیند کی آغوش میں چلی گئی تو وہ پلنگ سے اتر اور پائنتی کی جانب پہنچ کر قالین تلے محفوظ اس فولادی سلاخ پر پیر کا دباؤ بڑھا دیا جو اس مقصد کے لیے ہوا گیا تھا۔

جیسے ہی سلاخ دہلی، پٹنگ صندوق کے ڈھکن کی طرح گہرائی میں لٹک کر رہ گیا۔  
ناہید الٹ کر سینے کے بل کھڈ میں لگے ہوئے آہنی تیروں پر جاگری۔ ایک دردناک چیخ  
فضا میں گونج کر رہ گئی۔ غالباً سب ہی تیر اس کی پیٹھ اور گردن کی طرف ابھر آئے تھے۔  
اس کے فوراً بعد حمید نے کھڈے کے سرے پر اڑسائی ہوئی ڈور کو پکڑ کر ایک جھٹکا دیا۔  
آن واحد میں پٹرول بھرے گیلن الٹ گئے۔ یوں لگا جیسے ناہید کا سارا وجود پٹرول میں  
ڈوب گیا ہو۔ فی الفور ماچس نکال کر سلگائی اور کھڈ میں پھینک دی۔

خواب گاہ آگ کی روشنی میں نہا گئی۔ ناہید کی غیر انسانی چیخیں گونجتی رہیں۔ کھڈ  
سے اس قدر ناقابل برداشت بدبو اٹھنے لگی کہ وہ گھبرا کر خواب گاہ سے باہر نکل گیا۔  
ڈرتے، لرزتے اور کانپتے ہوئے اس نے جو نہی کھڈ میں جھانکا تو لبوں سے اطمینان کی  
طویل سانس نکل گئی۔

ناہید کو نلے کا ڈھیر بن چکی تھی.....!  
بلی کی کہانی ختم ہو چکی تھی.....!







ڈاکٹر حامد حسن، ممتاز علی کیانی، عقیل قریشی  
محمد سجاد بھٹی، سیف الملوک عباسی، یاسر حسنین  
محمد نعمان، ساگر زمان، ناصر محمود بلوچ